نگار

سالانہ چندہ ہندوستان و پاکستان
آٹھ روپیہ چھ آنہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی دس آنہ ۱۰/

تصانیف نیاز فتح پوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ للہ/ (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا، ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے، اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے جبر (علاوہ محصول)

من و یزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشائیاں اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے جبر (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) تعدد ازدواج (۱۶) عالم برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۲۲ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت جبر

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور اُن افسانوں کے مطالعہ سے آپ واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے، قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن۔ قیمت چار روپیہ للہ/

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گمشدہ فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مادیین کا مذہب، نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۵۶ء — "خدا نمبر"

جنوری ۵۶ء کے پہلے ہفتہ میں شایع ہو جائے گا

جن کا چندہ دسمبر ۵۵ء میں ختم ہو چکا ہے ان کے نام ذریعہ وی پی میں روانہ ہوگا لیکن جن کا چندہ ابھی باقی ہے وہ اس کے محفوظ پہونچنے کے لئے ۶ر کے ٹکٹ مصارف رجسٹری کے لئے بھیج دیں۔

یہ خالص تاریخی چیز ہوگا، جس میں بتایا جائے گا کہ تمام امم سابقہ میں اول اول مذہب کا خیال کس طرح پیدا ہوا، کن کن صورتوں اور پیکروں میں خالقِ عالم یا مدبرِ عالم کی پرستش کی، نیز یہ کہ اس تصور ربوبیت و خلاقی میں جغرافیہ، ماحول اور سماج کے کیا اثرات تھے اور رفتہ رفتہ ذہنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ خدا کا تصور کیونکر منزہ ہوتا گیا۔

یہ سالنامہ دراصل تمام مذاہبِ عالم کی مستند تاریخ ہوگا جس میں خالص تاریخی نقطۂ نظر سے تمام قوموں کی مذہبی زندگی، جملہ بانیان مذہب کی تعلیم و اصلاح اور مقدس کتابوں کی ہدایات پر مورخانہ تبصرہ کیا جائے گا، اس میں کوئی مناظرہ کا پہلو نہ ہوگا اور نہ کسی مذہب کے خصوصی تصورات، و شعائر، تعلیمات و ہدایت پر کوئی تنقید ہوگی — متعدد نقوش و تصاویر بھی اس میں شامل ہوں گی تاکہ بعض عقاید کے سمجھنے میں سہولت ہو اردو میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل پہلا مجموعہ ہوگا، جس میں پوری جامعیت و تحقیق کے ساتھ دنیا کے مذاہب کو پیش کیا جائے گا

منیجر نگار لکھنؤ

پاکستان کے خریدارانِ "نگار"

سالانہ چندہ (چھ) ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک ہمارے پاس لکھنؤ بھیجدیں ہماری مطبوعات بھی اسی پتہ پر خط و کتابت کرنے سے مل سکتی ہیں :-

ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی - ۱۰۵، سوبھ راج چیتوول روڈ - ویسٹ گارڈن - کراچی

ضروری اطلاع پاکستان کے خریداروں کو

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۵۵ء میں یا اس سے پہلے ختم ہو چکا ہے تو آئندہ چندہ (چھ) نمایندہ نگار کے پاس کراچی بھیجدیجئے اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس، تاکہ سالنامہ روانہ کیا جائے۔

منیجر نگار لکھنؤ

بعض کمیاب کتابیں

متفرق اُردو مطبوعہ

دریائے لطافت ---- انشاء اللہ خاں ------ ۷ے
موازنۂ انیس و دبیر ---- شبلی نعمانی ------ ۵ر
تذکرۂ آبِ بقا ------ عبدالرؤف عشرت ---- ۳ے
فرہنگ آصفیہ - ۲ حصے حرف الف تا س ----- ۶۰ر
چراغِ سخن ---- مرزا واجد حسین یاس ---- ۴ے
کلیات جان صاحب -- میر یار علی جان ----- ۴ر
کلیات سودا ---- مرزا رفیع سودا ------- ۷ے
کلیات ظفر، چہار دیوان ---- بہادر شاہ ظفر --- ۱۵ر
نشتر ------ یاس عظیم آبادی ------ ۴ر
دیوان قلق ---------- ۵ر
نقش جغتائی ---------- ۳۰ر
کلیات تراب ---------- ۱۰ر
تذکرہ کاملانِ رام پور ---------- ۱۰ر
مشاہیر عالم طبقۂ حکماء ---------- ۵ر
الہارون ------ مصباح الدین ---- ۷ے
قاموس المشاہیر، حصۂ اول ---------- ۱۰ر
نورجہاں بیگم ---- اشہری ---------- ۴ر
ہندو ادیب ---- ناظر کاکوروی ------ ۷ے

لغت فارسی قلمی و مطبوعہ

منتخب اللغات شاہجہانی ... عبدالرشید الحسینی ---- ۵ر
مصطلحات بہار عجم جلد اول - منشی ٹیک چند بہار ... ۱۰ر
غیاث اللغات -- محمد غیاث الدین، مطبوعہ ۱۲۶۵ھ ... ۱۵ر
برہانِ قاطع کشوری ۲ حصے کامل - محمد حسین برہان ... ۲۰ر
تثلیث اللغات -- انگریزی سے فارسی و ہندی و سنسکرت - ۲۰ر
منتخب لغات عثمانیہ ۲ حصے کامل، فارسی و عربی سے ترکی - ۲۵ر

ادب فارسی قلمی و مطبوعہ

کلیات اسماعیل --- اسماعیل اصفہانی ------ ۱۰ر
دیوان شمس تبریز --- محمد بن ملک داؤد ------ ۵ر
دیوان صائب --- محمد علی صائب ---------- ۷ے
کلیات صائب ---- محمد علی ---------- ۱۰ر
کلیات ظہیر ---- حکیم ظہیر فاریابی ---------- للعہ
کلیات سعدی --- شیخ مصلح الدین سعدی ------ ۱۰ر
دیوان قصاید عنصری --- حکیم ابوالقاسم ------ ۵ر

تذکرہ و سیر فارسی و مطبوعہ

تذکرہ صبح گلشن ---- علی حسن خاں ------- ۲۵ر
تذکرۂ دولت شاہ --- دولت شاہ سمرقندی ---- ۷ے
تذکرہ خزینۃ الاصفیا --- غلام سرور ۲۵ر

لغت عربی مطبوعہ

منتہی الارب ۴ حصے - مرزا عبدالرحیم ------ ۳۰ر
القاموس، چہار حصص --- محمد مجدالدین احمد ---- ۲۵ر
صراح معہ فرہنگ قراح --- ابوالفضل محمد بن عمر --- ۳۰ر
فقہ اللسان ۳ حصے --- کرامت حسین ------ ۲۵ر
کشاف اصطلاحات الفنون --- شیخ محمد علی ---- ۱۰ر

تاریخ فارسی مطبوعہ

جذب القلوب الی دیار المحبوب --- شیخ عبدالحق محدث دہلوی --- ۳۰ر
جہانگیر نامہ ---- خواجہ ابوالحسن ---------- ۵ر
وقایع نعمت خان عالی، انشائے حسن و عشق ------ ۵ر
درۂ نادرہ ---- مرزا محمد مہدی خاں ------- ۴ر
تاریخ گلستانِ ہند مصور ---- درگا پرشاد ------ ۱۵ر
تاریخ جامع التواریخ ---- فقیر محمد ------ ۱۲ر
اقبال نامہ جہانگیری سہ حصہ ... محمد شریف معتمد خاں --- للعہ

ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا - قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ
آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں وی پی ہوگا، جس میں

نگار

آپ کا چندہ دسمبر میں ختم ہوگیا اور جنوری کا "نگار"
سالنامہ ۵۶ء کی قیمت (مع مصارف رجسٹری) بھی شامل ہے

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۸	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۵۵ء	شمار ۶

ملاحظات ---------- ۳
قصاص سے پہلے ---- (نوابزادہ) رشید الظفر خاں (بھوپال) -- ۵
کچھ مدیر نگار سے ------ وقار احمد رضوی ----- ۱۷
داستان شاہین و کنجشک ---- اڈیٹر ---------- ۲۴
اقبال اور غالب ------ فرمان فتحپوری ------ ۳۲
عہد بنی امیہ و بنی عباس میں کنیزوں کا اثر و اقتدار --- اڈیٹر -- ۴۴
ایٹلانٹک سمندر سے ایک خط ---- سید نظیر حسین ----- ۴۹
غزل ------ مانی جایسی ---------- ۵۲
مشاعرۂ نگار ---------- ۵۳
منظومات:- فضا ابن فیضی - دل شاہجہانپوری سیف حسن پوری - ۵۴

ملاحظات

امن کی تلاش

تقسیم ہند کے بعد بھارت کی بین الاقوامی سیاسیات کے پس منظر کو ابھارنے اور مغربی سیاستدانوں کو اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا کرنے کے لئے نہرو کا روس جانا اور اس کے بعد ہی اکابر سوویٹ یونین کا ہندوستان آنا دونوں واقعے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر و مدارات دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں ہے، لیکن حالات کے لحاظ سے اس کے نتائج و اثرات ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور اس وقت جبکہ دنیا میں ہر طرف سے صلح و امن کی خواہش تو ظاہر کی جارہی ہے لیکن اس کے باوجود دل کی دھڑکنیں بدستور قایم ہیں، حکومتوں کی بڑی بڑی ہستیوں کا ایک دوسرے سے دوستانہ فضا میں ملنا اور ملکی پیمانوں پر تبادلۂ خیال کرنا غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

اکابر سوویٹ یونین کا جو پرجوش خیر مقدم یہاں ہوا ہے وہ چنداں قابلِ لحاظ نہیں، لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ مارشل بلگانن اور خرشچیوف نے اس خیر مقدم کو کس نگاہ سے دیکھا اور اپنے جذبات کے اظہار میں کس قدر بیباکی سے کام لیا، خواہ وہ کہیں کہیں متانت و سنجیدگی اور سیاسی مشرب کے اقتضاء کے منافی ہی کیوں نہ رہا ہو۔ انھوں نے نہ صرف ہندوستان کے امن پسندانہ پالیسی کو سراہا بلکہ خود اپنی صلح کوشیوں کو اس قدر مبالغہ کے ساتھ ظاہر کیا گویا۔" ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا"۔ اور اگر ان تمام بیانات کے حشو و زواید کو نکال دیا جائے تو کم از کم اس کا یقین تو کرنا ہی پڑے گا کہ موجودہ روس، اسٹالین کے روس سے بہت مختلف ہے اور وہ اپنے اشتراکی مقاصد تک کسی اور راستہ سے پہونچنا چاہتا ہے۔ یعنی

راہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہ دگر بردہ ایم ما

اسی کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اکابر چین و مصر و انڈونیشیا بھی اس سے قبل ہندوستان آکر وہی سب کچھ کہہ گئے ہیں جو سوویٹ

اکابر کہہ رہے ہیں، اور اب شاہ سعود بھی وہی پیام امن وصلح لیکر ہندوستان آئے ہیں، تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید تاریخ اب نیا ورق اُلٹنے والی ہے اور وہ امریکی صدی جو دوسری جنگ عظیم کے بعد شروع ہوئی تھی غالباً نہایت مختصر صدی ثابت ہوگی، لیکن اگر ایسا نہ ہوا جس کا امکان کم ہے تو پھر اس میں کلام نہیں کہ دُنیا کو تباہ و برباد ہو جانا ہے اور یہ تباہی و بربادی وہ نہ ہوگی جس کے بعد کرۂ زمین کو پھر کبھی آباد ہونے کی سعادت نصیب ہو سکے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا دُنیا کا کھویا ہوا امن وسکون یوں آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جنگ کو ختم کر دینے کا خواب دنیا صدیوں سے دیکھ رہی ہے لیکن یہ خواب اب تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا اور غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک جنگ کی مخالفت میں جو کچھ کہا گیا وہ زیادہ تر اخلاقی و روحانی دلایل پر مبنی ہوتا تھا اور انسان کے ذہنی و اخلاقی اقدار اتنے بلند کبھی نہیں ہو سکتے کہ وہ نفسی و ذاتی علایق سے ہٹ کر اجتماعی علایق پر غور کرے۔ لیکن اب حالات بالکل دوسرے ہیں اور سائنس کی ترقی نے دست قضا میں بجلی اور جواہر فرد دے کر انسان کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اگر اس نے امن وصلح کی راہ اختیار نہ کی تو انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے اسے فنا ہو جانا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے روس کے آہنی پردے کے پیچھے اور باہر دونوں طرف یکساں محسوس کیا جا رہا ہے۔ دُنیا اچھی طرح سمجھ گئی ہے کہ اب زمانہ معاہدوں اور صلح ناموں کا نہیں، عہد و پیمان، قول و قرار کا نہیں کیونکہ اس نوع کے تجربات ہمیشہ ناکام ثابت ہوئے ہیں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ آخر کار وہ اسی نتیجہ پر پہونچے کہ جب تک غیر مشروط طور پر جنگ کو ناجایزہ خلاف قانون قرار دیکر اس فیصلہ پر تمام قومیں مہر توثیق ثبت نہ کر دیں، بقاء عالم یا "جیو اور جینے دو" کی پالیسی کامیاب نہیں ہو سکتی، اور آج نہیں تو کل سرمایہ دار اور اشتراکیت پسند دونوں حکومتوں کو اپنے ڈھانچوں کے اختلافات سے ہٹ کر دنیا کے مستقبل کو اس خاص زاویہ سے دیکھنا ہوگا اور تخریب کی راہ سے تعمیر کی طرف جانے کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کرنا پڑے گا اور اگر موجودہ رجحانات نے یہی رخ اختیار کیا تو اس میں شک نہیں کہ اس کا بڑا کریڈٹ ہندوستان کو حاصل ہوگا۔

پاکستان اور بغداد پیکٹ

پاکستان کا بغداد پیکٹ میں شامل ہونا مشرق وسطیٰ کی برطانوی پالیسی کے لئے مفید ہو یا نہ ہو، لیکن خود پاکستان کے لئے یقیناً ضرر رساں ہے۔ وزیر اعظم پاکستان نے بغداد روانہ ہونے سے قبل ظاہر کیا تھا کہ وہ مشرق وسطیٰ کی دفاعی اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے ہر عملی اقدام کے لئے طیار ہیں اور اگر بغداد پیکٹ میں پاکستان کا شمول واقعی اس حد تک وسیع ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وقت ضرورت پاکستانی فوجیں برطانوی و امریکی کمان میں ملک سے باہر بھی جا سکیں گی اور خود اندرون ملک کے تمام بری، بحری و فضائی مرکزوں پر برطانیہ و امریکہ کا اقتدار تسلیم کر لیا جائے گا۔ جب تک جنگ نہیں ہوتی اس وقت تک تو بظاہر یہ بات بہت معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر کسی وقت لڑائی شروع ہو گئی تو پاکستان کے تمام اہم فوجی مرکزوں پر امریکہ کا چھا جانا یقینی ہے اور جنگ کے ختم ہونے پر امریکہ کا ہٹانا ناممکن ہو جائے گا۔ مصر ایک صدی کی کوشش کے بعد برطانیہ کو اسکندریہ سے ہٹانے میں کامیاب ہوا لیکن پاکستان تو صدیوں کے بعد بھی اس میں کامیاب نہ ہوگا کیونکہ برطانیہ کا عذر صرف یہ تھا کہ برطانوی سلطنت کے تحفظ کے لئے اسکندریہ پر قبضہ ضروری ہے لیکن امریکہ تو تمام دُنیا میں اشاعت تہذیب و خوشحالی کے لئے ایسا کرے گا اور ظاہر ہے کہ اس عذر کی وسعت و معقولیت کے پیش نظر پاکستان کب یہ ہمت کر سکتا ہے کہ وہ امریکہ کے ایسے بلند اخلاقی مقاصد کی مخالفت کرے اور دُنیا میں جاہل و غیر مہذب کہلائے۔

کشمیر کانفرنس

تقسیم ہند کے بعد کشمیر کانفرنس کا انعقاد سب سے پہلا معقول قدم ہے جو نزاع کشمیر کے سلسلہ میں پاکستان نے اُٹھایا ہے۔ کانفرنس میں ہر طبقۂ خیال کے لوگ موجود تھے اور انھوں نے پوری آزادی کے ساتھ جو کچھ کہنا تھا کہا۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ معلوم ہوا کہ خان عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خان، ہندوستان آکر نہرو سے گفتگو کریں گے، لیکن بعد کو یہ خبر آئی کہ خان عبدالغفار خاں نے اس خدمت کو قبول نہیں کیا کیونکہ بقول ان کے "جب خود پاکستان کے ارباب حل وعقد ہی انھیں غدار کہتے ہیں تو وہ کیا منہ لیکر ہندوستان جا سکتے ہیں"۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو یقیناً افسوسناک ہے، کیونکہ اس خدمت کے لئے عبدالغفار خاں سے زیادہ موزوں شخص کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا، تاہم ہمیں خوشی اس بات کی ضرور ہے کہ پاکستان نے باہمی گفت و شنید کا دروازہ بند نہیں کیا اور اگر ہندوستان و پاکستان دونوں مل کر کوئی معقول صورت رائے شماری کی پیدا کر سکے تو یہ جھگڑا آسانی سے طے ہو جائے گا۔

قصاص سے پہلے

(موت کا انتظار)

(نوابزادہ رشید الظفر خاں)

یہ فسانہ جسے ایک سانحہ یا واقعاتی المیہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا، مارچ ۵۵ء کے "ریڈرس ڈائجسٹ" میں شایع ہوا تھا۔ جس وقت میں نے اسے پڑھا تو بے اختیار جی چاہا کہ اس کا ترجمہ ہو جائے، لیکن چونکہ اب میں کام سے جی چرانے لگا ہوں اس لئے یہ خیال چرا نہ ہو سکا

پچھلی مرتبہ جب میں بھوپال گیا اور دوستوں کی محفل میں نوابزادہ رشید الظفر خاں مرحوم سے اس کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے زیادہ اس فسانہ سے متاثر ہیں۔ اور ان کا یہ تاثر اتنا گہرا تھا کہ جب میں نے ان سے اس کے ترجمہ کرنے کی درخواست کی تو وہ فوراً اس کے لئے آمادہ ہو گئے

یہ فسانہ کوئی فرضی کہانی نہیں ہے بلکہ حقیقی تاثرات ہیں ایک عورت کے جس کو پھانسی کا حکم سنایا جا چکا ہے اور قصاص سے قبل چند دن جیل میں گزار رہی ہے

یوں تو دنیا میں نفسیاتی مطالعہ اپنی جگہ بہت دلچسپ چیز ہے، لیکن ایسے شخص کے تاثرات و احساسات کا تجزیہ جو اپنی جان دینے جا رہا ہے، جو موت کے انتظار میں، وقت کے ہر ہر لمحہ کے ساتھ پھانسی کے پھندے کو اپنی گردن سے قریب آتے دیکھ رہا ہے، اور جو بدقسمتی سے یہ بھی محسوس کر رہا ہے کہ اس کی موت نفسیاتی انصاف کا تقاضہ نہیں بلکہ محض قانون کی بیرحم انگلیوں کی حرکت کا نتیجہ ہے۔ بڑا مشکل کام ہے۔ جس طرح مرنے کے بعد کا علم صرف اسی کو ہو سکتا ہے جو مر چکا ہے، اسی طرح مرنے سے قبل انسانی دل پر جو گزرتی ہے اس کا علم صرف اسی کو ہو سکتا ہے جو مرنے جا رہا ہے اور اگر کوئی شخص دل و دماغ کے اس تشنج اور روح کی اس بے ساختہ چیخ کو قلمبند کر سکے تو وہ بھی لٹریچر میں نئی چیز ہوگا۔

اس فسانہ میں اسی "عالم یاس و یقین" کے تاثرات کو پیش کیا گیا ہے، اور اتنی صداقت کے ساتھ کہ انتظار مرگ کی ہچکیوں اور سسکیوں سے لیکر پھانسی کے جھٹکے تک کی تمام ناشنیدہ آوازیں پوری طرح ہمارے دل و دماغ تک پہونچ جاتی ہیں

ظاہر ہے کہ نفسیاتی نزاکتوں کا اظہار خاص زبان اور خاص انداز بیان چاہتا ہے جس کی کامیاب مثالیں ہمیں انگریزی میں تو مل جاتی ہیں، لیکن اردو میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ پھر اگر اردو میں کوئی طبعزاد فسانہ اس رنگ کا لکھا جاتا تو وہ اپنے لٹریچر کے مزاج کے لحاظ سے اس کو اسی انداز میں پیش کیا جا سکتا تھا لیکن ایک غیر زبان سے ترجمہ کرنا اور اصلی زبان کی خصوصیات بیان کو قایم رکھتے ہوئے، خود اپنے لب و لہجہ کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا آسان کام نہ تھا۔ اس لئے نوابزادہ کا اس دشوار خدمت کو اپنے سر لینا دراصل ان کے ادبی ذوق کا بڑا نازک امتحان تھا جس سے وہ اگر اتنی کامیابی کے ساتھ نہ گزرتے تو غالباً ہم بھی قارئین نگار کے سامنے اس جنس گرانمایہ کو کبھی نہ پیش کر سکتے

واقعہ صرف اتنا ہے کہ ایک لڑکی میری ہملٹن کو ایک شخص سے محبت ہو جاتی ہے جس کا نام جم ہے، جم بھی اول اول

محبت کا جواب محبت سے دیتا ہے، لیکن پھر وہ ایک دوسری لڑکی لیوسی سے وابستہ ہو کر ہملٹن کو چھوڑ بیٹھتا ہے - قدرت اس بے وفائی کا انتقام اس سے اس طرح لیتی ہے کہ لیوسی بھی جم کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف ملتفت ہو جاتی ہے اور جم اس صدمہ کو برداشت نہ کر کے خودکشی کر لیتا ہے - ہملٹن جو جم کی بیوفائی کے باوجود اس سے غیر معمولی محبت رکھتی ہے اس حادثہ کو برداشت نہیں کر سکتی اور وہ لیوسی کو جم کا قاتل سمجھ کر ایک رات اس کے مکان پر جاتی ہے اور پستول سے اس کو ہلاک کر ڈالتی ہے - جج پھانسی کی سزا تجویز کرتا ہے اور ہملٹن چند دن انتظارِ مرگ میں بسر کرنے کے لئے جیل بھیجدی جاتی ہے - اور یہاں وہ اپنے تاثرات کی ڈائری مرتب کرتی ہے - جس میں غم و غصہ، انتقام و نفرت رشک و محبت، مایوسی و مجبوری اور خدا جانے کن کن جذبات کی تصویر اس نے کھینچی ہے - یہاں تک کہ قصاص کا وقت آتا ہے، اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے، ہاتھ پاؤں رسیوں سے کس دئے جاتے ہیں، گلے میں پھندا ڈال کر تختہ کھینچ لیا جاتا ہے اور اس کے گھٹے ہوئے حلق سے نکلنے والی آخری چیخ پر یہ ڈائری ختم ہو جاتی ہے

نوابزادہ صاحب نے اپنے خط میں مجھ سے یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ میں اس امر پر بھی روشنی ڈالوں کہ جن حالات میں لڑکی نے قتل کیا تھا ان کے پیشِ نظر وہ واقعی سزائے موت کی مستوجب تھی یا نہیں،

میں پوری طرح محسوس کرتا ہوں کہ نوابزادہ کے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا اور مجھے یقین ہے کہ اگر فیصلہ نوابزادہ کے اختیار میں ہوتا تو وہ کبھی اس لڑکی کو سزائے موت کا حکم نہ سناتے - کیونکہ اس نے جس دوسری لڑکی کو قتل کیا تھا وہ خود ایک شخص کی جان لے چکی تھی (ہاتھوں سے نہ سہی باتوں سے) اور ذہنی نفسیاتی انصاف کا تقاضہ یہی تھا کہ جب ایک بار جان کا بدلہ جان سے ہو چکا تھا تو اس سلسلہ کو آئندہ جاری نہ رہنا چاہئے تھا - لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جم نقضِ عہد کر کے میری ہملٹن کے جذبات کا خون اس سے قبل نہ کر چکا تھا اور وہ سزا کا مستحق نہ تھا - بہرحال جو صورت بھی ہو ——— بقول ٹینی سن، فطرت و قانون دونوں کے "ناخن و چنگال" خون سے رنگین رہتے ہیں اور ان کو رنگین رکھنے کے لئے کسی نہ کسی کو اپنا خون پیش کرنا ہی پڑتا ہے، جذبات کا ہو یا عروق و شرائین کا ! (نیاز)

میں میری ہملٹن ہوں ——— کون جان سکتا ہے، کہ میں اس وقت کتنی خوف زدہ ہوں - !! - آج صبح میری قید کی کوٹھری میں جیلر آئی، اور اُس نے مجھ سے کہا کہ: "میری اپیل نامنظور ہو گئی ——— یہ نیلی وردی والیاں جو میری نگراں ہیں۔ ہر وقت مجھ پر نگاہ رکھتی ہیں اور دو - دو۔ ہر وقت مجھ پر مسلط رہتی ہیں ——— اس کے جانے کے بعد چپ بیٹھی ہوئی ہیں -

دوپہر کے کھانے کے بعد مس برانڈن (نگراں) بار بار مجھ سے پادری کا ذکر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ میں اُس سے ملوں - تین مرتبہ میں انکار کر چکی ہوں - لیکن ممکن ہے آئندہ شاید انکار نہ کر سکوں، کیونکہ مجھے اس کی ناکامی و مایوسی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے ——— میں نے سگریٹ جلایا ——— مگر سگریٹ مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا - میں اپنے پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی - اس وقت میرے خیالات پراگندہ ہیں - لیکن مجھے اب بیٹھ کر سوچ میں نہیں پڑنا چاہئے ! - سوتے وقت دیکھا جائے گا ——— مہربانی کر کے ایک سیاہ کپڑا مجھے دیدیا گیا ہے تاکہ اُس کو میں اپنی آنکھوں پر رکھ کر سو جاؤں - مجھے کبھی روشنی میں نیند نہیں آتی - اُس مرتبہ جب جم اور میں گرمیوں کے موسم میں بنگلے میں رہنے چلے گئے تھے، تو روز صبح پانچ بجے، روشنی سے میری آنکھ کھل جاتی تھی -

——— میں صرف اندھیرے میں سو سکتی ہوں، لیکن یہ میں نے کیا کہا - ارے ! - یہ تو ہونا ہی ہے ——— اندھیرا ——— کبھی نہ ختم ہونے والا اندھیرا ! ——— میں فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی - ان عورتوں سے میں بیزار ہوں - یہ ڈیوٹی پر آنے جانے والی عورتیں، نیلی وردی میں - میرے سامنے سے ہر وقت گزرتی رہنے والی عورتیں ! ——— ہر طرف عورتیں !! - میرے لئے عذاب ہو کر رہ گئی ہیں -

—— جب تک کہ خود میرے کانوں نے پوری آواز نہ سنی - مجھے اس کا احساس ہی نہ تھا کہ میں زور سے بول رہی ہوں - میں یہ کہہ رہی تھی کہ " بلاؤ - پادری کو بلاؤ " میں اس سے ملنا چاہتی ہوں -

پادری آیا - میں کھڑی ہوگئی - وہ کم عمر معلوم ہوتا تھا - دودھ کی طرح سفید کالر کے مقابلہ میں اُس کا رنگ دھندلا اور راکھ جیسا معلوم ہوتا تھا - نگراں عورتیں میرے زندان سے باہر ہوگئیں - اُصولاً صرف پادری ہی مجھ سے تنہائی میں مل سکتا ہے - اُسنے پوچھا: " تمھیں ڈاک برابر مل رہی ہے ؟ "- میں بولی :- " ہاں ! ایک خط ماں نے لکھا - اور ایک بھائی نے "۔

—— " تم کچھ چاہتی ہو ؟ - کتابوں کی ضرورت ہے ؟ - مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو ؟ "

—— " نہیں ! نہیں ! ابھی نہیں ! " - میں کبھی زیادہ پڑھنے کی عادی نہیں تھی - میں زیادہ مذہبی بھی نہیں ہوں - پھر میں نے پوچھا ، گویا میں جیلر کی بات سُن ہی نہ رہی تھی ، " وہ وقت کب آئے گا ؟ "—— پادری کے چہرہ پر ایک رنج کا تناؤ سا پیدا ہوا - اور میں سوچ میں پڑگئی کہ " کیا وہ اُلٹی میری ہی ہمدردی چاہتا ہے "—— پادری کھڑا ہوگیا اور بولا :-

" یہاں تمھیں ابھی دو ہفتے اور گزارنے ہیں - اور پھر — بشرطیکہ — ملتوی نہ ہوجائے ، تیسرے ہفتہ میں ....."

میرا جی چاہا کہ وہ جلد چلا جائے — کیونکہ مجھے اب متلی سی ہونے لگی تھی — ایک لمحہ وہ مجھے دیکھا کیا - پھر پہرے والیوں کی طرف — جو اس وقت باہر کھڑی تھیں - اس نے اشارہ کیا - اور چل دیا - " اب مجھے قے آرہی تھی ، میں چلمچی کی طرف بڑھی اور برانڈن میری طرف لپکی —— میں پلنگ پر پڑگئی - اس نے اپنی گھڑی دیکھی - اور کہا " دوسری گارڈ والیاں تھوڑی دیر میں آجائیں گی " میں نے دیوار کی طرف اپنا منھ پھیر لیا - چابی پھرانے کی آواز آئی - جس سے میں سمجھی - کہ گارڈ بدل گیا - یہ چھ ، چھ گھنٹہ کی ڈیوٹی کرتی تھیں - میں نے کروٹ لی مس مکفرلین ٹوپی اُتار چکی تھی - اُس کے ہلکے رنگ کے بالوں پر روشنی پڑرہی تھی - دونوں نے تاش کھیلنا شروع کیا - انھوں نے مجھے پلٹ کر دیکھا - میں بولی :- " مجھے کالا کپڑا دیدو " وہ لے آئی — ایک گلاس میں پانی بھی لائی اور ایک گولی دے کر کہا :- " ڈاکٹر چاہتے ہیں کہ یہ تم کھالو - اس سے نیند آجائے گی " —— میں نے گولی کھالی - اور پانی بھی پی لیا - اس نے مجھ کو چادر احتیاط سے اُڑھادی —— جیسے میں کوئی بچہ ہوں ، اور بولی :- " چپ چاپ سوجاؤ "۔

کاش میں مکفرلین کے ساتھ تنہا ہوتی ، کیونکہ اسی کے پاس ہونے سے میرے دل کو سکون ملتا ہے - اس میں ایک متانت و سکون ہے دوسروں کی طرح بے قرار نہیں رہتی ، نہ میری طرف تکتی رہتی ہے اور باوجود سیاہ وردی کے وہ مجھے نہایت شائستہ اور سنجیدہ معلوم ہوتی ہے میں شائستہ عورتوں سے ہمیشہ مانوس رہی ہوں - میں نے ایک BEAUTYPARLOUR —— میں کام کیا ہے - وہیں میری جم (M ann) سے پہلی ملاقات ہوئی تھی — " جم ، تم پہلے مجھ سے خوش تھے - شاید اس لئے کہ میں بھی تم سے محبت کرتی تھی ، لیکن نہیں - میں سمجھتی ہوں غالباً میری محبت ہی کی وجہ سے تم کو مجھ سے نفرت ہوئی - واقعی میں کیا تھی ! کچھ نہیں ، اور لیوسی کے پاس سب کچھ تھا - لیکن اب ہمارے —— کسی کے پاس کچھ نہیں ہے "۔

یہ سوچ کر — مجھے کچھ عجیب احساس ہوا - چکر سے آنے لگے - غنودگی بڑھی — شاید یہ گولی کا اثر ہے مکفرلین نے کالا کپڑا اُٹھایا وہ زمین پر گر گیا تھا اور میری آنکھوں پر رکھدیا - " کیا پھانسی سے پہلے یہی ہوگا ؟ "- اس کا جواب اُس نے نہیں دیا - سیاہ کپڑے کی اوٹ کی وجہ سے میں اس کے احساسات کا اثر اُس کے چہرے پر کچھ نہ دیکھ سکی !

میری ماں جب کبھی اخبار میں قتل کا کوئی واقعہ دیکھتی تو کہا کرتی کہ لوگوں کو قاتل کے ساتھ بہت ہمدردی ہوجاتی ہے مگر مقتول کا بھی تو کچھ خیال کرنا چاہئے - بیچاری ماں !! - اسے کیا خبر تھی - کہ یہی بات خود اس کے گھر میں بھی ہونے والی ہے —— ہاں مجھے لیوسی سے بھی ہمدردی ہونا چاہئے —— بیچاری لیوسی —— لیکن آخر میں بھی تو دل رکھتی تھی -

" قتلِ عمد " جج کے الفاظ غالباً یہی تھے - اور قتلِ عمد شاید بہت بری بات ہے — اشتعال میں قتل کرنے سے زیادہ بُری !-

وہ لیوسی کو نہیں جانتے تھے - اگر اُسے جم کے ساتھ ہمدردی ہوتی، تو میں شاید معاف کر دیتی - خیر، دنیا اس سے پاک تو ہو گئی:- مگر کس قدر عجیب بات ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جم ایسی عورت کے لئے اپنی جان دیدے گا؟"

مجھے بھوک نہیں ہے — میں آج کھانا نہیں کھاؤں گی — گارڈ کو کچھ فکر ہوئی ——— بولی: "تھوڑا سا کھانے کی کوشش فرمائیے" گویا میں کوئی جانور تھی جسے بڑے دن کی دعوت کے لئے فربہ کیا جا رہا تھا۔

"لو، یہ کوکو پی لو" ——— "ہاں، برانڈن پی لوں گی"

"کچھ لوگ تم سے ملنے آئے ہیں" ——— "خدا کرے میری ماں آج روئے نہیں - ابھی تو کچھ وقت باقی ہے - آخری ملاقات میں جتنا چاہیں رو لیں - خدا کرے وہ وقت جلد آجائے — یہ انتظار بہت تکلیف دہ ہے - میں اسی میں گھلی جا رہی ہوں ——— کو تو یہ انتظار نہیں کرنا پڑا - مجھے کیوں یہ تکلیف دی جا رہی ہے" ——— میری ماں اور بھائی ——— دروازہ کی جالی اور کانچ کے پیچھے عجیب سے معلوم ہو رہے ہیں -

ایلن اچھی صورت کا لڑکا ہے - ۱۸ سال کی عمر کے لحاظ سے قد بھی کافی بڑا ہے - میرے بعد یہ ماں کے دل کا سہارا ہوگا - ماں جس قدر اس سے محبت کرتی تھی مجھ سے نہیں — پھر بھی یہ واقعہ اس پر بہت شاق گزرے گا — آلن نے کہا "ماں، ہوم سکریٹری کو لکھ رہی ہیں - اور ہم رحم کی درخواست طیار کرا رہے ہیں" ——— میری ماں کے آنکھوں میں آنسو آگئے - یکایک افسر نے کہا کہ "وقت ہو گیا"۔ میری آنکھوں پر اندھیرا سا چھا گیا ——— میں صرف یہ آوازیں آتی رہیں - کہ "لیٹ جاؤ - لیٹ جاؤ - ذرا آرام کرو" ڈاکٹر آیا، میری آستین چڑھائی - اور مجھے ایک انجکشن دیا -

چند روز میں میری سالگرہ ہوگی اور میں ۳۲ سال کی ہو جاؤں گی — فریڈ سے میری شادی ۱۸ سال کی عمر میں ہوئی تھی - اس سے الگ ہونے پر میری ماں ہمیشہ مجھ کو الزام دیتی تھیں — مگر میں نے اس پر کبھی افسوس نہ کیا — اگر ہمارے بچے ہو جاتے - اگر جنگ نہ شروع ہو جاتی تو شاید نوعیت کچھ اور ہو جاتی — جب وہ جنگ سے لوٹا - تو بہت بدلا ہوا تھا - افسردہ اور جھنجھلایا ہوا سا رہتا تھا — اگر میں اُس کے ساتھ لگی لپٹی رہتی — تو شاید یہ واقعات بھی نہ ہوتے — کیا جم سے میری ملاقات ناگزیر تھی — کیا یہ بھی لازم تھا کہ میں جم سے ملتی اور لیوسی کو مار ڈالتی — کاش جم یہاں ہوتا اور مجھ سے ملتا - لیکن وہ تو لیوسی پر اتنا دیوانہ تھا؟ - ایسا دیوانہ کہ جب اسے یقین ہو گیا کہ لیوسی اس کی نہیں ہو سکتی تو خودکشی کر لی ——— مگر میں بھی تو جم سے محبت کرتی تھی ——— اتنی محبت میں نے کسی سے نہیں کی۔

آہ، جم، تم نے ایسا کیوں کیا؟ — تمہاری زندگی میرے لئے بہت عزیز تھی، تم نے اُسے کیوں ختم کر دیا؟ — ہاں، میں نے لیوسی کو ——— بیشک میں نے اسے مار ڈالا - اُس نے بھی تو میری زندگی ختم کر دی تھی - اب میں مرنے والی ہوں ——— نہیں، میں مرنا نہیں چاہتی — مجھے یقین ہے کہ یہ عورتیں جو مجھ پر پہرا دے رہی ہیں، خود بڑی تکلیف میں ہیں - لیکن ان میں سے کوئی نہیں سمجھ سکتا - کہ میں کیا سوچتی رہتی ہوں - اور وہ سمجھ بھی کیا سکتی ہیں جبکہ میرے دل کی بات زبان تک آتی ہی نہیں - خواب میں شاید کچھ زبان سے نکل جاتا ہو، اس کا مجھے علم نہیں — آج صبح پادری نے مجھ سے پوچھا - کہ "تم نماز پڑھنا چاہتی ہو" میں "ہاں" کہوں تو کس قدر فریب ہوگا — میں برسوں سے گرجے کے قریب بھی نہیں گئی — پھر بھی شاید ہاں کہدینا زیادہ آسان ہوگا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے - کہ پادری عورتوں سے گھبراتا ہے، اس کے لئے شاید یہ پہلا موقع ہے مجھے اس کے ایک ناخن پر چھوٹا سا سفید دھبہ نظر آیا، میں سوچنے لگی، جب ناخن بڑھ جائے گا تو وہ سفید دھبہ نکل جائے گا - مگر اس وقت شاید میں نہ ہوں گی۔

یہ ہفتہ پہاڑ ہو کر رہ گیا ہے کسی طرح کٹتا ہی نہیں، لیکن اب وقت زیادہ دور نہیں، اور باقی دن جلد کٹ جائیں گے — دیوار زنداں کا ایک ایک نشان، ایک ایک دھبہ مجھے معلوم ہے - کرسی کی ہر ہر درز سے واقف ہوں - میں نے نظروں سے ہر ہر چیز اور

فاصلہ کا اندازہ لگا لیا ہے - جہاں جہاں سے رنگ پیٹرا گیا ہے، اس کا ہر ہر نشان میرے ذہن میں ہے - جب مجھے چہل قدمی کے لئے آج باہر لیجایا گیا - تو دیوار پر ایک بڑی بلی بیٹھی ہوئی تھی - وہ میری طرف آئی اور میرے پاؤں سے اپنا جسم رگڑنے لگی اور خوشی کی ایک آواز نکالی - میں نے اُس کے نرم بالوں پر اپنا ہاتھ پھیرا "تم سے بہت خوش ہے" — ہل نے کہا : " دوسرے اجنبیوں کی طرف تو وہ رخ بھی نہیں کرتی " جب ہم واپس ہوئے - تو اُس نے "میاؤں" کیا اور ہماری طرف دیکھا - میرا جی چاہا کہ میں اُسے اندر لیجاؤں ——— آج اتوار کی صبح ہے - جیل کا گھنٹہ بج رہا ہے - کسی نے کہا: "ہلٹن پادری آنے ہی والا ہے" - پادری اپنا جُبہ پہنے ہوئے عجیب سے معلوم ہو رہے تھے، دُعا پڑھی - اور مجھ سے بھی پڑھوائی -

" اے خدا تو نے وعدہ کیا ہے کہ تو ہمارے گناہوں کو بخش دے گا، اس لئے مجھ پر کرم کر، رحم فرما ——— (مگر خدا پر تو مجھے عقیدہ ہی نہیں ہے ——— اور میرے سامنے عدالت کا کمرہ ہے جہاں جوری کے ممبروں سے میرے گناہگار یا بیگناہ ہونے کے بارہ میں رائے طلب کی جاتی ہے اور مجھے قتلِ عمد کا مجرم قرار دیکر پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے)

اخیر میں پادری آمین کہتا ہے اور میں بھی نہایت آہستگی سے آمین کہدیتی ہوں -

---

ہل کی ڈیوٹی ہے - جب میں نظر اُٹھاتی ہوں، اسے اپنی ہی طرف دیکھتا ہوا پاتی ہوں - شاید وہ اپنے دوستوں کو میری داستان سنائے گی — لوگ تو صرف وہی باتیں جانتے ہیں، جو اخباروں میں آتی ہیں — وہ یہ کیا جانیں کہ ایسی بات کرنے سے قبل دل پر کیا گزرتی ہے اور وہ جذبۂ نفرت کتنا سخت ہوتا ہے جو ہمیں کسی کو قتل کر دینے پر مجبور کر دیتا ہے -

میرے جوتے مجھے تکلیف دے رہے ہیں - جیل کے افسر چاہتے ہیں کہ دوسری جوڑ مجھے لادیں — اس خیال کے ساتھ ہی لیوسی کی تصویر میرے سامنے آگئی جب وہ BEAUTY SHOP میں پہلی بار آئی تھی - اور سب سے پہلے میں نے اس کو خوبصورت سیاہ سویڈ کے جوتے پہنے دیکھا تھا - جن کی ایڑیاں بہت اونچی اور سبک تھیں - اُس کی ٹانگیں بہت سڈول تھیں، اُس کے جسم میں کوئی خاص بات نہ تھی - لیکن اُسے کپڑے پہننا بیشک آتا تھا، مجموعی حیثیت سے وہ اچھی معلوم ہوتی تھی، اُس کا حسن سادہ تھا اور چہرہ کا رنگ بڑا پیارا اس کی آنکھیں گڑیوں کی طرح معصوم تھیں اور کانچ کی طرح چمکیلی اور نیلگوں ——— پھر بھی اُس کو خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تھا - اس کی عمر ۴۰ سال کی تھی، لیکن پھر بھی وہ معمر نہیں معلوم ہوتی تھی -

جب اول دن دوکان میں آئی - تو مجھے وہم بھی نہ تھا کہ جم اُس کو جانتا ہے - سنا ہے — کہ وہ اُس سے پہلے پہل، اول کسی شراب خانہ میں ملا تھا - دونوں پی کر مخمور ہوئے، اور ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے، شاید لیوسی نے پہلے اس میں کچھ کشش محسوس کی - لیکن وہ ایسی تھی ہی نہیں کہ کسی مرد کی پابند ہو کے رہ جاتی تاوقتیکہ وہ اس کی سطح و خیال کا انسان نہ ہو -

جم بے چارہ ہفتہ میں تین بار ایک معمولی درجہ کے نائٹ کلب میں پیانو بجاتا تھا - مگر مخمور ہو جانے کے باعث اپنے کام کو کبھی نہیں پہونچتا تھا - فن کے اعتبار سے اس میں بڑی خوبیاں تھیں - لیکن کاہل تھا - اگر کبھی وہ کچھ روپیہ کما بھی لیتا، تو جوئے کی نذر کر دیتا - لیوسی اُس کو روپیہ دیتی تھی اور اپنے ساتھ اچھے اچھے کلبوں میں لے جاتی تھی - جہاں وہ خود نہ جا سکتا تھا — تعجب ہے کہ وہ اس پر کس طرح قابو پا گئی - وہ تو ایسا نہ تھا — کہ کسی عورت کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا، وہ تو خود اپنی مرضی کے مطابق، عورت پر حکمرانی کرنے کا شایق تھا اور اس پر اکثر ناز کرتا تھا - لیکن خیر، اب اِن باتوں کو یاد کرنے سے کیا فایدہ - وہ تو مر گیا ——— اور عنقریب میں بھی مر جاؤں گی - لیکن سوچتی ہوں کہ مجھ میں کیا کمی تھی کہ میں اُس کو پسند نہ آسکی - مجھے یاد ہے کہ جب جم مجھے پہلی بار سینما لے گیا - تو ہم آخری قطار میں تھے - اُس نے مجھے اپنی باہوں میں لے کر - مجھے اپنے سے لگا لیا، میں اپنا کوٹ اُتار چکی تھی اور میں بلاؤز کے باریک کپڑے کے نیچے اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے خوش ہو رہی تھی - میں نے اُس کی طرف دیکھا - تو اُس نے مجھے جھک کر پیار کیا - جی چاہتا تھا کہ وہ

بوسہ دائمی ہوکر رہ جائے! — اس رات وہ میرے گھر پہ آیا - میں ہرگز یہ نہ سمجھتی تھی کہ ایسا ہوگا - میں ڈرتی رہی - ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں کوئی اور ہوں - بالکل اجنبی و بیگانہ - جو ایک ایسی آواز سے رو رو کر شکوہ کر رہی ہے جس کو میں خود نہیں جانتی اور بار بار کہتی ہے کہ مجھے چھوڑ دو — مجھ سے دور ہٹ جاؤ — میں چونک کر اُٹھ بیٹھی اور پھر اپنے آپ کو وہیں زنداں میں پایا - مکفرلین مجھے قریب سے جھک کر دیکھ رہی تھی — اتنی قریب سے — کہ اُس کی آنکھوں کی باریک نیلی رگیں - صاف دکھائی دے رہی تھیں - اُس کے گال پر بائیں جانب ایک چھوٹا سا نشان تھا - نرمی سے وہ مجھ سے کہہ رہی تھی: "سوجاؤ - تمھیں سونا چاہئے - سوجاؤ - سوجاؤ" - رفتہ رفتہ اُس کی صورت دھندلی ہوتے ہوتے چھپ گئی -

صبح ہوگئی - ڈاکٹر مجھ سے باتیں کر رہا ہے — آج ایک خاتون تم سے ملنے آرہی ہے - وہ ایک مصنفہ ہے، اور جیل خانوں کے نظام کی اصلاح کے متعلق بہت کچھ لکھ چکی ہے -

مجھے امید ہے کہ تم اُسے پسند کروگی - اگر اپنے دل کا حال سنانا چاہتی ہو - تو اُس سے بہتر تمھیں کوئی نہیں ملے گا - میں نے کچھ نہیں کہا - اور نہ میں کچھ کہنے کے قابل رہی تھی - میں اس قدر تھکی ہوئی اور افسردہ تھی کہ انکار بھی میرے بس سے باہر تھا -

مس بلائی آئی - اس کی شکل عجیب سی تھی - لیکن وہ تھی بہت اچھے مزاج کی - صبح صبح وہ پھولوں کی "نمایش" سے ہوکر آئی تھی - آتے ہی مجھے ایک فہرست دی - جس میں بہت سے پھولوں کے بیج جو وہ اپنے باغ کے لئے خرید کر لائی تھی، درج تھے - بعض لوگ شاید سمجھیں کہ یہ بڑی ناموزوں سی بات تھی - لیکن مجھے اس کی سادگی اچھی معلوم ہوئی - اس نے بنفشہ کے پھولوں کا ایک بٹن اپنے کوٹ سے نکال کر مس برانڈن کو دیکر کہا کہ اسے ایک گلاس میں پانی بھر کر میرے پاس رکھدے - اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ میں نے اُس سے کچھ کہا - اُس نے صرف اتنا کہا کہ میں پھر آنے کی کوشش کروں گی - اس نے مجھ سے ہاتھ تک نہ ملایا اور چلی گئی میں سوچتی رہی کہ اُس کے پاس جو بیج تھے - وہ جب اپنے باغ میں لگائے گی تو وہ اُگ بھی آئیں گے، لیکن مجھے کبھی اس کا حال نہ معلوم ہوگا -

کل یہ ہفتہ بھی ختم ہو جائے گا - کبھی، کبھی یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ دن کب ختم ہوا اور رات کب آئی - وقت میرے لئے ساکن ہے - لیکن ٹکڑے ٹکڑے ہوکر - وقت کی تقسیم میرے لئے اب صرف اس طرح ہے، چہل قدمی کرنا - کپڑے اُتارنا - کپڑے پہننا اور جیل کے افسروں کو آتے جاتے دیکھنا - یہ سب مجھے ایسے نظر آتے ہیں، جیسے خواب کے سائے!

معلوم نہیں بِل کا کیا حشر ہوا - وہ گزشتہ جنگ میں اسٹاف افسر تھا - اُس سے میں دو مہینے تک ملتی رہی - وہ میرے لئے اکثر کھانے کی چیزیں لایا کرتا تھا، جولام پر اُس کی ماں بھیجتی رہتی تھی - وہ کھانا بہت ہی اچھا پکاتا تھا - اکثر میرے کمرے پر آتا کھانا پکاتا، کھاتا اور وہسکی پیتا رہتا - اُس کے پاس ایک پستول تھا، جس کا ذکر عدالت میں بارہا آیا - گو وہ اس کے رکھنے کا مجاز نہ تھا، تاہم اُس نے مجھے اُس کا چلانا سکھایا میرے پاس چھوڑ گیا اور کہہ گیا کہ اسے رکھو - یہ چوروں کو ڈرانے کے لئے کبھی نہ کبھی کام آئے گا - ایک عرصہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ فرانس میں مارا گیا - اس کا پستول میرے پاس برسوں سے میز کے سب سے نیچے کے خانہ میں پڑا رہا - اُس کا ذکر میں نے جم سے مصلحتاً نہیں کیا، وہ بھی تو بعض باتیں مجھ کو نہیں بتاتا تھا — اس کا حال مجھے کبھی معلوم نہ ہوتا - اگر مس روز مجھ سے اُس کا ذکر نہ کرتی - وہ اسی دوکان میں کام کرتی تھی - جم کو دور سے پہچانتی تھی - کیونکہ وہ مجھ سے اسی دوکان میں ملنے آتا تھا - ایک روز اُس نے مجھ سے کہا کہ اُس نے جم کو ایک عورت کے ساتھ کسی کلب میں دیکھا تھا - مجھے شبہ پیدا ہوا - کیونکہ مجھ سے تو وہ کہہ کر گیا تھا، کہ میں اپنے ایک مرد دوست کے ساتھ جا رہا ہوں - جب وہ ملا، تو میں نے اُس سے پوچھا، اُس نے جواب دیا کہ مس روز کو غالباً دھوکا ہوا، وہ میں نہ تھا کوئی اور رہا ہوگا - کچھ دن کے بعد — لیوسی پھر آئی اور مس روز نے مجھے بتایا کہ یہ وہی ہے - جو اُس رات کو جم کے ساتھ تھی — بعد کو جم نے بھی اقبال کیا - اور کہا کہ وہ میرے ایک دوست کے ساتھ آئی تھی اور ہم تینوں ایک جگہ بیٹھ گئے تھے" جھوٹ بولنے میں تو وہ مشاق تھا - اُن دنوں تو میں خواب میں نہ سوچ سکتی تھی کہ وہ میرے سوا کسی اور سے کوئی واسطہ رکھ سکتا ہے - عورتیں بھی مردوں کے بارہ میں کتنا دھوکا کھاتی ہیں -

کل رات میں نے لیوسی کو خواب میں دیکھا، بڑا بھیانک خواب تھا۔ وہ زندہ تھی اور مجھ سے ملنے کے لئے آئی تھی۔ سلاخوں کے باہر سے مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ اب مجھے یہ یاد نہیں کہ میں وہاں کیوں تھی اور وہ مجھ سے کیا کہہ رہی تھی۔ اُس کی شبیہہ میرے سامنے تھی۔ اور اُسکی نیلی آنکھیں مجھے تک رہی تھیں۔ میں نے نظر چُرائی، دریچہ سے بھی نظر ہٹالی۔ جب میں نے دوبارہ اُس کی طرف دیکھا، تو وہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی اور آنکھوں کی جگہ دو بڑے بڑے سیاہ سوراخ نظر آنے لگے، اُس وقت مجھے یاد آیا کہ میں نے تو اُسے قتل کر دیا تھا اور میں چیخنے لگی۔ جب میں اُٹھی تو دیکھا کہ مس مکفرلین میرے پاس کھڑی تھی اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اور نرمی سے کہا:۔ گھبراؤ مت تم نے شام کوئی بُرا خواب دیکھا تھا، مگر وہ غلط کہہ رہی تھی خواب کیسا، میں نے تو واقعی لیوسی کو قتل کیا تھا اور میرا خواب جھوٹا نہ تھا۔

اوٹھتے ہی میں نے پوچھا کہ آج کیا دن ہے ——— بدھ ——— اگر التواء نہ ہوا، تو آج ہی کے دن آیندہ ہفتہ جو کچھ ہونا ہے ہو جائے گا۔

پادری نے مجھے ایک کتاب دی ہے، اُس میں کچھ اشعار اور مشہور مقولے درج ہیں، اس کا ایک جملہ ہے، جس کو میں صدہا بار پڑھ چکی ہوں، میں نے کتاب کے آخر صفحہ پر اُسے لکھ بھی لیا ہے۔ "رات تو اب آ ہی گئی ہے اور خود کو رات کے سپرد کر دینا ہی بہتر ہے" — ہاں، میرے لئے بھی شاید یہی بہتر ہوگا۔ لیکن، میں اپنی جان کو خود سپرد نہیں کر سکتی، میں زندہ رہنا چاہتی ہوں، اس وقت جان سے زیادہ عزیز مجھے کوئی شے نہیں ہے۔

میرا آج صبح اُٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا، میں نے اُٹھنے سے انکار بھی کر دیا۔ اس انکار کا میرے گارڈ نے جو اثر لیا وہ مضحکہ خیز تھا۔ لیکن روزانہ یکساں طور پر وقت کاٹتے کاٹتے میں تھک گئی تھی اس لئے میں نے حکم عدولی کی ٹھان لی۔ گارڈ نے کہا:۔ "ہلٹن اگر تم بیمار ہو تو یہ دوسری بات ہے، ورنہ قاعدہ کی پابندی تمھیں کرنا ہی پڑے گی، اُٹھو۔ ہلٹن کے سفید بال کچھ اُلجھے سے تھے اور پریشانی کے آثار اس کے چہرہ کی جھرّیوں سے ظاہر ہو رہے تھے۔

وہ بولی :۔ "معلوم ہوتا ہے، مجھے ڈاکٹر کو بلانا پڑے گا"۔ ڈاکٹر آیا، اور بولا:۔ "ہلٹن، کیا تمھیں کوئی تکلیف ہے"۔ میں نے اپنے پلنگ پر کچھ حرکت کی، اور سوچا۔ "اور کیا تکلیف ہی تو ہے"۔

میں نے کہا :۔ "بیشک مجھے تکلیف ہے۔ لیکن ایسی تکلیف نہیں ہے۔ جسے تم دور کر سکو"۔ یہ کہکر میں بے ساختہ رونے لگی، اور میرے رخساروں سے گرم گرم آنسو ڈھلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ ڈاکٹر نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ "یہ انتظار کسی کے لئے کبھی آسان نہیں ہے۔ لیکن قاعدہ کی پابندی (خواہ کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو) کرنے کا یہ اثر ضرور ہوگا کہ جب وقت آئے تو تم اپنے آپ کو زیادہ طیار پاؤ گی"۔ میرے کاندھے پر اُس کے ہاتھ کا دباؤ بڑھ چلا اور میں نے سنا کہ وہ مسز سے کہہ رہا تھا :۔

"ان کے کپڑے لاؤ، اور ان کو پہنا کر طیار کرو"۔

مس بلائی آج پھر آئیں۔ وہ جیل کسی کام سے آئی تھیں۔ جب وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر چکیں تو اچانک اُنھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا تمھیں اپنے کئے کا افسوس نہیں ہے"۔ میں سوچنے لگی، اُس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں جھوٹ بول دیتی، اس خیال سے کہ میں ڈوب تو رہی ہوں، شاید کسی تنکے کا سہارا مل جائے، لیکن اس کے چہرہ پر صداقت و خلوص کے آثار دیکھ کر میں جھوٹ نہ بول سکی اور کہہ اُٹھی کہ "مجھے اپنے کئے پر ذرا بھی افسوس نہیں ہے"۔

میں نے بلا ارادہ ایک سخت لہجہ اختیار کر لیا تھا۔

اس نے ٹھنڈی سانس لی اور بولی : "مجھے اس کا یقین نہیں کہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو، وہ دل سے کہہ رہی ہو، بہر حال میں تم سے جرح کرنے نہیں آئی ہوں، اتنے دنوں میں تم نے خود اس معاملہ پر کافی غور کر لیا ہوگا"۔

وہ اُٹھی اور خدا حافظ بھی نہیں کہا اور چل دی۔

میں آج شام بالکل بے قابو ہوں، آج میری ماں یکایک آگئی ہے، پہلے تو اپنے دریچہ تک جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر فیصلہ کیا کہ نہ جاؤں گی - اور اپنی ماں سے نہیں ملوں گی - میری نگراں نے خاموشی سے اپنے کمرے تک پھر مجھے واپس پہونچا دیا - میں بہت روئی ـــــ مس مکفرلین کہنے لگی "خواہ کچھ ہو، پھر بھی وہ تمھاری ماں ہے - تمھیں اُس سے ملنا چاہئے" - اب وہ پلنگ کے قریب کھڑی تھی اور میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی، اُس کا لہجہ دھیما مگر حاکمانہ تھا - اُس نے کہا کہ "اب بھی تم کو اپنے سوا کسی سے ہمدردی نہیں ہے" - یہ سُنکر میں ٹھٹک کر رہ گئی اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ـــ اس نے کہا: "کیا تمھیں یہ احساس نہیں ہے، کہ یہ وقت تمھارے عزیزوں کے لئے کس قدر سخت ہے، تمھارا کیا ہے، چند دن بعد رہو یا نہ رہو - لیکن اُن کو تو زندگی بھر یہ غم سہنا پڑے گا" جب وہ یہ کہہ رہی تھی، تو میرا عجیب حال تھا - میں روتی تھی - اور ہنستی بھی تھی - پھر میسن آئی اور اُس نے کہا: "اپنی ماں کو اتنا انتظار نہ کراؤ" مکفرلین نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی طرف، کچھ دیر بعد میں اُٹھی اور اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی تو گئی لیکن جب ایسا وقت آتا ہے، تو دوسروں کی آنکھوں میں جذبۂ ہمدردی دیکھنے کو بھی جی گوارا نہیں کرتا -

---

آج پیر کا دن ہے، اب ہر آنے والا دن بہت اہم ہوتا جا رہا ہے - جب جیلر مجھے دیکھنے آئے ـــ تو مجھے اعلان سننے کے لئے طیار رہنا چاہئے، مجھے معلوم ہے کہ پھانسی کی تاریخ وہی بتلائے گی ـــــــ محبت - نفرت - حسد - جلاپا، ان سب جذبات سے وہ بھی بخوبی واقف ہو گی، لیکن جو کچھ میں کر گزری، شاید وہ کبھی نہ کر سکتی!

آج کی رات بہت سخت ہے - کسی پہلو چین نہیں ـــــ برانڈن نے میری طرف دیکھے بغیر کہا: - "ٹہلنا بند کر دو اور اپنے پلنگ پر لیٹ جاؤ، شاید یہ آخری رات ہے" - میں نے اپنے تصور میں جیلر کو دیکھا کہ وہ آکر مجھ سے کہہ رہی ہے ـــــ یہ میں ضرور معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ پھانسی کی کونسی تاریخ ہے، مگر کوئی مجھ سے کہے نہیں کہ فلاں تاریخ میرے گلے میں پھانسی ڈالکر لٹکا دیا جائے گا.

میں آج صبح جلد اُٹھی ـــ جیل میں ایک خاموشی سی چھائی ہوئی ہے، جب تک گھنٹہ نہیں بجے گا - خاموشی چھائی رہے گی - گھنٹہ سے قیدیوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ ایک رات اور گزر گئی، اور دوسرا دن شروع ہو گیا -

کل بھی آج ہی جیسی صبح ہو گی اور میں اُٹھ کر یہ محسوس کروں گی کہ دن ختم ہونے پر وہ رات آئے گی - جس کی صبح میں آخری مرتبہ پلنگ سے اُٹھوں گی ـــــــ "جیلر تم سے ملنے آئی ہے ـــ پادری تم سے ملنے آیا ہے ـــ یہ ہیں تمھارے خط ـــ یہ ہیں اخبار ـــ یہ لو صاف کپڑے - کپڑے بدلو" -

میں اُٹھ کر جیلر کے سامنے آئی - وہ میری آنکھوں کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی، اُس کی نظر میری پیشانی سے کسی قدر اونچی جمی ہوئی تھی - اُس نے کہا ہلٹن مجھے تم سے کہنا ہے کہ ہوم ڈپارٹمنٹ نے التواء منظور نہیں کیا! جمعرات کی صبح تم کو پھانسی دیجائیگی" اس وقت اُس کی آواز مجھے بہت دور سے آرہی ہے - اور اُس کی شکل میری آنکھوں میں دھندلی ہوتی جا رہی ہے آج منگل ہے - میں نے چائے پی لی ـــــ آج منگل ہے - پھانسی جمعرات کی صبح کو ہو گی -

تالے میں کنجی کے پھرانے کی آواز میرے کانوں میں آئی - اب دروازہ بند ہے ـــ اب دروازہ کھل رہا ہے - زمین پاؤں تلے سے نکل رہی ہے ـــ ارے گری - گری ـــ کالا کپڑا ہٹاؤ، بتیاں بجھائی جا رہی ہیں - میری پیاری "میری پیاری" یہ جم کے آخری الفاظ تھے ـــ مگر میں اُس وقت اُس کی پیاری کہاں تھی شاید میں کبھی بھی نہ تھی - مجھے یقین تھا ـــ کہ وہ یوسی سے ہفتوں نہیں ملا ہے - وہ مجھے یقین دلا چکا تھا کہ یوسی سے اُس کا واسطہ ختم ہو چکا ہے - مجھے یاد ہے میں اس وقت اپنا آسمانی رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی - اور نیلم کے وہ بُندے بھی جو جم نے میری سالگرہ پر دئے تھے ـــ سینما سے نکلتے ہی بارش شروع

ہوگئی تھی - میں نے جلد - جلد اپنے کمرے کا رُخ کیا - راستہ میں اُس نے کوئی بات نہ کی، جب ہم شام کہیں ساتھ گزارتے تو رات وہ اکثر میرے ہی کمرے پر گزارتا تھا - وہ جھک کر میرے رخساروں پر ہاتھ پھیرتا رہا اور بہلا کر مجھ سے کہہ رہا تھا کہ "ہمارے تمھارے لئے یہی اچھا ہے کہ ہم جدا ہو جائیں - میں لیوسی کو نہیں چھوڑ سکتا، میں اُسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتا" میں نے کہا:- جم اُس نے تم پر کیا جادو کر دیا ہے! تم تو اُس سے زیادہ مانوس نہ تھے"۔ یہ کہکر میں نے اُسے اپنی طرف کھینچا - اُس نے میری گردن میں ہاتھ ڈالا اور سوچنے لگا -

مجھے اپنی کمزوری پر شرم بھی آئی - لیکن میں نے اُس سے نہایت عاجزی سے کہا کہ "کل مجھ سے ضرور ملنا"۔ اُس نے وعدہ کیا اور کہا:- "اچھا، میں ایک بار اُس سے اور مل لوں، شاید میں اُسے علٰحدہ ہونے کے لئے طیار کر سکوں - پیر کی صبح کو تم سے ضرور ملوں گا" دروازہ تک گیا، پھر لوٹا - میری ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر میرا سر اُٹھایا، جب میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو اُس نے مجھے پیار کیا اور چلا گیا -

وہ پیر کی رات کو نہیں آیا، رات بھر میں اُس کا انتظار کرتی رہی - صبح میں نے اس کو ٹیلیفون کیا، مالک مکان بولا:- "میں اُسے بلاتا ہوں" — کافی دیر کے بعد جب وہ لوٹا تو اُس نے مجھ سے کہا کہ غضب ہوگیا - جم نے کمرہ میں گیس کھول کر خودکشی کر لی - ایک پرچہ لیوسی کے لئے چھوڑ گیا ہے، جس میں لکھا ہے کہ "زندگی سے موت بہتر سمجھتے ہوئے میں خودکشی کر رہا ہوں" — اس تحریر میں میرے لئے کوئی پیغام نہ تھا -

بعد کو معلوم ہوا کہ اتوار کی شام کو وہ لیوسی سے مل چکا تھا اور اس نے جم سے صاف کہدیا تھا کہ وہ کسی اور سے شادی کر رہی ہے اور اب جم سے اُس کا ملنا ممکن نہیں ہے -

جم پیر کے روز سے اپنے کام پر بھی نہیں گیا، دن بھر شراب پیتا رہا — اس کی خودکشی کا اخبار میں بھی ذکر تھا - لیکن اخبار کے ایک گوشہ میں صرف دو سطریں تھیں، جم غریب دنیا کے لئے معمولی انسان رہا ہو، لیکن کوئی میرے دل سے پوچھے - کہ وہ کیا اہمیت رکھتا تھا - زندگی میں، میں نے کبھی کسی سے نفرت نہ کی تھی، لیکن لیوسی کا قصہ اور تھا - اُس کے خیال سے مجھے تشنج سا ہونے لگتا تھا — اس واقعہ کو تین مہینے گزر گئے تو دفعتاً مجھ میں جذبۂ انتقام پیدا ہونے لگا، اور میں نے اُس کو مار ڈالنے کا پختہ ارادہ کر لیا

مقتول کے وکیل نے اس بات پر بہت زور دیا - اگر میں اُسی وقت لیوسی کو قتل کر دیتی تو شاید بچ جاتی - میرے پاس اگر بل کا پستول نہ ہوتا، تو شاید کبھی قتل نہ کرتی — اب میرے خیالات میں پھر اُلجھن پیدا ہوئی، خاص کر اُس وقت جبکہ میں پادری کے سوال پر غور کرتی ہوں اب میں یہ کیسے سوچوں کہ مجھے اپنے کئے پر افسوس ہے، یا نہیں - پادری کہتے تھے کہ مجھے روحانی سکون صرف اُس وقت ہو سکتا ہے - جبکہ میں اپنے کئے پر پشیمان ہو جاؤں، جب تک مجھے صرف اپنے حال پر افسوس رہے گا - اُس وقت تک مجھے کوئی سکون نہیں مل سکتا اور میں اسی اُدھیڑ بُن میں ختم ہو جاؤں گی - میرے سوچنے کے لئے صرف ایک دن اور ایک رات باقی ہے -

میں سمجھتی تھی کہ میں تمام واقعات پر دوبارہ غور کر سکوں گی، لیکن مجھ سے نہ ہو سکا، کیونکہ میں اپنا یقین کھو چکی ہوں - مجھے کسی بات پر اعتماد نہیں ہے - جب ڈر چھایا ہوا ہو - تو یہ چیز اور بھی مشکل ہو جاتی ہے، مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد بھی نہیں آتا - جب میں نے لیوسی کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، ہاں، اتنا یاد ہے کہ کنجی ملنے سے پہلے میرا ارادہ مستحکم ہو گیا تھا - چابی جم کے پرانے اوور کوٹ کی جیب میں پڑی تھی - یہ کوٹ وہ میرے ہاں ایک بار چھوڑ گیا تھا، یہ مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ یہ کنجی لیوسی کے کمرے کی ہے - یہ میری صرف امید موہوم تھی - ایک رات جب کافی اندھیرا ہو گیا تو میں اس کے کمرے پر گئی اور چابی لگا کر دیکھی، وہ اُسی کی نکلی - پھر ایک روز شام کو میں پستول لیکر وہاں پہونچی، بیشک میں نے بڑا خطرہ مول لیا - ممکن تھا کہ اُس کے ساتھ، اُس وقت کوئی مرد ہوتا، اب پھر مجھے کچھ یاد نہیں آتا کہ کیا ہوا - اتنا ضرور یاد ہے کہ میں نشست گاہ میں کھڑی تھی - پستول میں نے پیٹھ کے پیچھے چھپا لیا - کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی ——— وہ

زمین پر پڑی تھی اور پستول میرے ہاتھ میں تھا، میں نے کبھی کسی کو مردہ نہیں دیکھا تھا، لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ مر چکی ہے - میں نے ——— اس کا خون جذبۂ انتقام میں کیا - اب مجھے قتل کیا جائے گا - کسی کو کیا اگر مجھے اس بات پر افسوس ہے یا نہیں - اب تو میں ایک جانور کی حیثیت رکھتی ہوں - دن رات میرے رکھوالے مجھ پر نظر رکھتے ہیں - اُن کو میرے بھاگ جانے کا ڈر ہر وقت رہتا ہے - بس -

اس کمرے کی چار دیواری میں جو خوف ہے - وہ ہر چیز میں سما چکا ہے وہ میرے جسم میں ہے - میں اسے چھو سکتی ہوں - وہ میرے دل کی پرشور دھڑکنوں میں ہے، وہ میرے پہرے والیوں کی آنکھوں میں ہے - وہ پادری کے سیاہ جبہ کی سلوٹوں میں ہے - اور جب میں نماز پڑھتی ہوں تو میرے ارکان نماز میں شامل رہتا ہے - وہ میری ہی طرح ایک مہیب حیوان ہے - میں اُس کے ساتھ رہ نہیں سکتی اور بغیر اُس کے مر بھی نہیں سکتی

بار بار، غسل خانہ جاتی ہوں - پیٹ کی شدید مروڑ ہر منٹ بڑھتی جا رہی ہے، یہاں تک کہ رانوں اور ٹانگوں تک پہونچکر اُن کو مفلوج سا کر دیتی ہے -

مجھے تعجب ہے کہ میں چلتی، پھرتی کیونکر ہوں -

آج صبح میں نے اپنی صورت آئینہ میں دیکھی، چہرہ سُت گیا ہے - میری آنکھیں کبھی اتنی بڑی اور ڈراؤنی نہ تھیں، اب میں اپنے بالوں کو کیوں بناؤں، غازہ کیوں لگاؤں - مُردے کا سنگھار کون کرتا ہے -

---

آج شام کو ایک عجیب واقعہ پیش آیا - جب میں چائے پی رہی تھی، تو یکایک مجھے محسوس ہوا کہ گرم چائے حلق سے نہیں اُترتی - مجبوراً میں نے اُبکائی لی - ہاتھ میرے گردن کی طرف بڑھے، میری اُنگلیاں خود بخود میرے گلے کو زور سے دبانے لگیں، پھر پھانسی کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آگیا اور خوف سے سمٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی -

بیکر میرے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھ - میرے گھٹنوں پر رکھ دئے اور مجھ سے آہستہ آہستہ کہتی رہی، مجھے بہت افسوس ہے ——— خدا تم پر اپنا رحم کرے -- جب میں نے اُس کی طرف دیکھا، تو وہ رو رہی تھی -

آج بُدھ کا دِن ہے - مجھے اکثر چیخوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں اور میں خواہ مخواہ کچھ نہ کچھ اپنے دل میں بکتی رہتی ہوں، کچھ بے ربط جملے، بے جوڑ باتیں -- میں سوچتی ہوں کہ کہاں دفن کرتے ہوں گے، شاید اسی مٹی کے ڈھیر میں جہاں میں چہل قدمی کو لیجائی جاتی ہوں -

برانڈن بولی :- آج صبح کافی گرمی ہے - آج تمھیں شال کی ضرورت نہیں ہوگی، میرے شانہ پر ہاتھ رکھا اور کہا :- "آج شام کو باہر بہت ہی اچھا معلوم ہو رہا ہے، چلتی ہو باہر" میں نے کہا "اچھا" - اس نے معمول سے زیادہ دیر تک مجھے باہر رکھا - پھر میرے پاس آئی - میرے منہ سے منہ ملاتی تھی اور غرغر کرتی تھی، پھر اچانک بلا کسی اشارہ کے کود کر نکل گئی - میں تھوڑی دیر تک کھڑے ہو کر دھندلے آسمان کی طرف جس میں جا بجا سفید ابر کے دھبے نظر آ رہے تھے، دیکھتی رہی - یہ میرا آسمان کو دیکھنا بالکل آخری بار تھا -

میں بھول چکی تھی کہ میں نے مس ہلائی سے ملنے کے لئے کہا تھا - جب برانڈن انھیں لیکر آئی - تو مجھے کسی قدر تعجب ہوا -

میں نے محسوس کیا کہ اس مرتبہ اس نے مجھ سے نظریں چرالیں، شاید وہ مجھے دیکھنے کی تاب نہ لا سکتی تھی - اُس نے اپنے دستانے اُتار کر، اپنی جیبوں میں ٹھونسنا شروع کر دئے، جب وہ بولی تو اُس کی آواز دبی - دبی تھی - گو وہ میری طرح پہرے والیوں کی موجودگی سے باخبر تھی - لیکن اُن کی موجودگی ایک دُھندلے پس منظر میں ڈوبی ہوئی تھی -

وہ بولی :- "کیا تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو" میں نے تھوڑا سا توقف کیا، لیکن جواب میں الفاظ بے ساختہ میری زبان پر آ رہے تھے - "میں آپ کے کہنے پر غور کر چکی ہوں، میں اپنے کئے پر شرمندہ ہونا چاہتی ہوں، مگر اب وقت نہیں ہے" میری زبان سے الفاظ بے ساختہ جلدی جلدی نکل رہے تھے - میری آواز کچھ ایسی تھی کہ میں مشکل سے اسے اپنی آواز سمجھ سکتی تھی، میں اپنے کئے پر پشیمان ہونے سے بھی

ڈرتی ہوں - میں ہمت سے کام لینا چاہتی ہوں، مگر یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا، اب وقت بہت قریب ہے - میں اور کچھ نہیں سوچ سکتی، سوا اس کے کہ میں کل صبح مرنے والی ہوں — میں اس کی طرف دیکھ نہیں سکتی تھی، مگر نظر ان کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طرف تھی، جو اسوقت میز پر رکھے ہوئے تھے - پھر وہ بولی :- "یقین کرو کہ جب تم صبح بیدار ہوگی تو تمہارا بُرے سے بُرا وقت گزر چکا ہوگا، تمہارے جرم کا بار تمہارے شانوں سے اُٹھا دیا گیا ہوگا، تم آزاد ہوگی، تمہارے اعضاء تمہاری ہر منشاء کی تعمیل خود بخود کریں گے، تمہارے خیالات کچھ ایسے ہوں گے، جیسے خواب میں ہوتے ہیں"۔ یہ کہتے کہتے اس نے آنکھیں بند کرلیں - آخر میں اس نے کہا کہ "جب تم اُس خواب سے بیدار ہوگی تو تم خدا کے سایۂ عاطفت میں پہونچ جاؤ گی"۔

میں نے کھانا کھایا - جیلر مجھے دیکھنے آئی - مجھ سے پوچھا :- "کیا میں کچھ کہنا چاہتی ہوں"- میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا - اس نے پھر کہا کہ "ڈاکٹر مجھے کوئی خواب آور دوا دے گا اور مجھے اب اپنے دماغ سے ہر بات نکال دینے کی کوشش کرنا چاہیئے"۔

میں اس کو دیکھ رہی ہوں، — مگر دیکھ نہیں سکتی - وہ چلی جاتی ہے - میرے پاس ماں اور بھائی کے خط آئے - میں نے اب تک نہیں پڑھے - میں ڈاکٹر سے کہوں گی کہ آج رات کو مجھے خواب آور دوا نہ دے - یہ میری آخری رات ہے، میں اسے جاگ کر گزارنا چاہتی ہوں - کہ مجھے غنودگی آرہی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے سخت بخار ہے - کاش میں اس وقت جی بھر کر رو سکتی -

پادری میرے روبرو بیٹھا ہوا ہے - اس کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اہم کام کو انجام دینے کے لئے کس قدر بیتاب ہے میرے اس کے درمیان ایک خلیج حایل ہے - جس کو میں سمجھ نہیں سکتی - شاید وہ میرے گناہ کو نہیں سمجھ سکتا اور نہ اس کے نزدیک اُس گناہ کا کوئی کفارہ ہے -

پادری :- کیا تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو، اگر تمہاری کوئی آخری آرزو ہے تو مجھ سے کہدو - میں کوشش کرکے اُس کو پوری کراؤنگا"

میں نے سر ہلا دیا -

پادری کی اب آواز دھیمی پڑ گئی، اُس میں اب جھرجھراہٹ سی محسوس ہوتی تھی -

وہ بولا :- "میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں، میں تمہیں روحانی تسکین و تقویت دینا چاہتا ہوں، تاکہ تم کل بلا خوف و خطر عالم بقا میں داخل ہوسکو"۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا -

پادری نے انجیل ہاتھ میں لیکر جلد جلد اُس کی ورق گردانی شروع کی - میں خاموش سنتی رہی -

پادری رخصت ہوا اور یہ کہکر چلا گیا کہ "کل صبح میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا - گارڈ نے مجھ سے کہا :- "اب لیٹ جاؤ"۔

مکفرلین سے ملنے کو میرا بہت جی چاہا - میں نے پوچھنا بھی چاہا کہ وہ آج ڈیوٹی پر آئے گی یا نہیں - لیکن نہیں پوچھا، میں اُس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونا چاہتی تھی - آج تمام دنیا میں وہی ایک ہے، جس کے چھوڑنے کا مجھے افسوس ہے - آج میں رات کے کپڑے آخری بار پہن رہی ہوں - پادری شاید صبح نو بجے پہونچے گا، ہاں شاید اُس نے نو بجے ہی آنے کو کہا تھا - (نیند میں) جم، جم نہیں، آج رات کو ہرگز نہیں میں تمہارے قابل نہیں ہوں، اب مت آنا - کبھی نہ آنا -

میں چونک کر اُٹھی، مکفرلین میرے پاس بیٹھی تھی، میں نے اس کی آستین پر ہاتھ رکھا اور پوچھا - "دیر تو نہیں لگے گی"۔ اُس نے جواب دیا :- "نہیں صرف چند لمحے — وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھی - دوسری گارڈ بھی موجود تھی، مگر مجھے اُس کی موجودگی کا احساس نہ تھا - میں نے دریافت کیا کہ "مس مکفرلین، آپ کا مذہب اور آپ کے اعتقادات آپ کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہوں گے"۔ اُس نے جواب دیا کہ :- "میں اُن کے بغیر جی ہی نہیں سکتی"۔

جم بغیر لیوسی کے بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا - میں جم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی، اب میں تنہا بغیر کسی کی معیت کے مرنے والی ہوں

شاید مکفرلین نے میرے خیالات کا اندازہ لگالیا اور کہا: "خدا ہم سب کے ساتھ ہے - خواہ ہم اُس پر ایمان رکھتے ہوں - یا نہیں - اُس وقت بھی جبکہ ہم اُس کے وجود کے منکر ہوں"۔

میں نے کروٹ لیکر دیوار کی جانب اپنا منھ پھیر لیا اور تکیہ میں چہرہ چھپالیا - میرے خیالات کا اولجھا ہوا ڈراؤنا خواب میرے ہول کو نہ دبا سکا - ایک چیخ اندر سے اُٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی جو زیادہ بڑھتی جاتی تھی - مجھ پر لرزہ طاری تھا -

مجھ کو کمبل پر کمبل اُڑھائے جارہے تھے - میں نے اُٹھ کر دیکھا، مکفرلین نے اپنی ٹوپی پہن لی تھی - جس سے میں سمجھی کہ گارڈ بدل رہا ہے - اُس نے جھک کر میرے شانوں پر ہاتھ پھیرا - اور کہا کہ :- "میری، تمھیں خدا کے سپرد کرتی ہوں"۔ گارڈ نے مجھے اُٹھایا - میں پلنگ سے گھبراکر اُٹھی، کپڑے بدلنا کچھ عجیب بات معلوم ہوتی تھی - میرا نیلا سایہ میرا سفید بلاؤز دُھل چکا تھا دونوں صاف اور بغیر شکن کے تھے - اب وہ میلے نہ تھے - جب میں نے اُنھیں عدالت میں پہنا تھا تو کافی میلے تھے، میں نے خود بخود اُس کا کالر ٹھیک کیا -

---

"نہیں - نہیں - میں کچھ نہیں کھاؤں گی"۔ دریچہ کھلا - صبح ہوگئی، لیکن بہت دھندلی صبح ہے - کچھ کُہر کے بھی آثار ہیں - میرے کپڑے کس قدر سخت معلوم ہوتے ہیں، میں بار بار اُن پر ہاتھ پھیرتی ہوں - کیا یہ میرے ہی کپڑے ہیں ؟ - میرے ہی جوتے ہیں ؟ - جب میں اُن کی پالش کی چمک دیکھتی ہوں - تو مجھے وہ بہت دور معلوم ہوتے ہیں - ان کو کس نے پالش کیا — کون، کیا - کیا میں بول رہی ہوں نہیں - ہرگز نہیں - کچھ نہیں کھاؤں گی -

وہ مجھے لینے آرہے ہیں - مجھے معلوم ہے - اب میں لیجائی جاؤں گی - ان ہی کپڑوں میں - اسی بلاؤز میں - اسی لباس میں - انھیں جوتوں کو پہنے ہوئے -

کسی نے آواز دی - ہلٹن، ہلٹن — "یہ کیا کہہ رہے ہیں"۔ شاید پادری آیا - پادری کچھ پڑھ رہا ہے -

فو نے پی لو - میں نے پی لی - شاید برانڈی ہے - میرے پیٹ میں گرمی محسوس ہوتی ہے - میں نے پلٹ کر گلاس اُسے واپس کیا - اب اُس کی شکل دھندلی نظر آرہی ہے - میرے ہاتھ میری پیٹھ کے پیچھے باندھے جارہے ہیں - ہتھکڑی ؟ - نہیں - کیا فایدہ - اب چل چلاؤ ہے — کوئی چیز میرے چہرے پر ڈالی گئی - کچھ گردن میں پہنایا گیا - اب صرف اندھیرا ہے، نہایت گہرا اندھیرا اور میں اس میں ڈوبتی جارہی ہوں - میرے پاؤں کسی چیز سے باندھے جارہے ہیں، اُف تاریکی، اتنی سخت تاریکی — حجم، تم کہاں ہو ——————!

"نگار" کے پچھلے تین سالنامے

سالنامہ ۳۱ء جس میں علم "فراست التحریر" کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیکھ کر آپ ایک شخص کا سواد خط دیکھ کر اس کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ کرسکتے ہیں — صرف ایک کاپی باقی ہے —————— قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۳۷ء اس میں "ڈراما اصحاب کہف" اڈیٹر کے قلم سے پورا شایع ہوا ہے اور "خلافت و امامت" کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہوا ہے —————— قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۳۸ء اس میں "تاریخ اسلامی" کے عہد خلافت و امامت پر مختتم بحث کی گئی ہے جس کی ابتداء ۳۷ء میں ہوئی تھی —————— قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

پچھ مدیر "نگار" سے

(وقار احمد رضوی)

(الف) "نگار" کے "علومِ اسلامی و علماءِ اسلام نمبر" کے حصۂ اول میں آپ نے خلافتِ عثمانی کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس عہد میں بنو امیہ برسرِ اقتدار آ گئے تھے" جس سے باہمی اختلاف رونما ہوئے اور خلیفۂ عثمانؓ کو علمی خدمات کے لئے کوئی موقع نہیں مل سکا (حالانکہ پھر بھی ان کے عہد میں قرآنِ مجید کی ترتیب و تدوین ہو سکی) - اس کی مزید تشریح آپ نے پچھلے سالنامہ ۵۴ء میں کی ہے - جس میں یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ خلیفۂ عثمانؓ نے اپنی خلافت میں "اقربا نوازی" سے کام لیا تھا - اور ولایت و امارت پر زیادہ تر اپنے رشتہ داروں کو مامور کیا تھا -

ویسے یہ کوئی نیا اعتراض نہیں - خلافتِ عثمانی پر "عزلِ عمال" اور "اقربا نوازی" کے اعتراضات قدیم زمانہ سے غیر مدلل طور پر دہرائے جاتے رہے ہیں - مورخین کے ایک گروہ نے حضرت عثمانؓ کی زندگی کے حقایق کو بڑی حد تک پردۂ خفا میں رکھنے کی کوشش کی ہے - لیکن اگر تحقیق و جستجو سے تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو اس خلیفۂ معصوم کی زندگی کے صحیح حالات معلوم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں - حضرت عثمانؓ کی نرم دلی، مروت اور رقیق المزاجی نے جہاں اُن کی حیاتِ طیبہ کو صدمہ پہونچایا وہاں اُس سے اسلامی تاریخ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی - عام طور پر ان کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی سیاسی زندگی "عزلِ عمال" اور "اقربا نوازی" کی اُلجھنوں میں پھنس کر رہ گئی تھی (کاش! اس نظریہ کے موجدین خلافتِ راشدہ کے آخری ابواب کو گہری نظر سے مطالعہ کرنے کی زحمت فرمائیں) حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو بہت سے مقامات تو ایسے ہیں، جہاں عزلِ عمال ہوا ہی نہیں - اور جن چند علاقوں میں عزلِ عمال ہوا وہاں کے اربابِ نظامت کو عثمانی نسب سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا - چنانچہ یمن کے دارالسلطنت، صنعاء پر یعلیٰ بن منیہ اور جند پر عبداللہ بن ربیعہ، عہدِ فاروقی سے اپنی جگہوں پر متمکن تھے اور خلافتِ عثمانی کے آخری دن تک یہ لوگ اپنی جگہوں پر بدستور کام کرتے رہے - اس کے علاوہ مکہ پر عبداللہ بن حضرمی، طائف پر قاسم بن ربیعہ، حمص پر عبدالرحمٰن بن ربیعہ اور رے پر سعید بن قیس، وہ لوگ ہیں جن کو حضرت عثمانؓ سے کسی قسم کی قرابت نہیں تھی - اب رہے مصر و شام و کوفہ و بصرہ جو خلافتِ عثمانی کے چار بڑے عسکری مرکز تھے - ان میں سے شام پر معاویہ عہدِ فاروقی سے مامور تھے - اُن کا انتخاب ظاہر ہے عہدِ عثمانی میں نہیں ہوا - کوفہ کے لئے حضرت عمرؓ کی وصیت تھی کہ مغیرہ بن شعبہ کے بجائے سعد بن وقاص کو وہاں کا گورنر بنایا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا - گو کہ بعد میں ان کے بجائے ابو موسیٰ اشعری کو اس عہدہ پر مامور کیا گیا جو حضرت عثمانؓ کے عزیز نہ تھے - مصر میں عبداللہ بن ابی سرح کو معزول کرنے کے بعد محمد بن ابی بکر کو وہاں کا والی مقرر کیا گیا تھا - حالانکہ محمد بن ابی بکر، حضرت عثمانؓ کے رشتہ دار نہیں تھے - بلکہ کچھ مخالف ہی تھے - رہے عبداللہ بن عامر، بصرہ کے گورنر ہیں، جو ان کے عزیز کہے جا سکتے ہیں - لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے تقرر میں حضرت عثمانؓ کی ذاتی رائے کو کوئی دخل نہ تھا - اہلِ بصرہ نے جب ابو موسیٰ اشعری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو اہلِ بصرہ کی خواہش کے مطابق عبداللہ بن عامر کو وہاں کا گورنر بنا دیا گیا -

یہ وہ تاریخی حقایق ہیں، جن سے خلیفۂ سوم کی سیاسی زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے - اس کے علاوہ اور بھی بہت سے واقعات ایسے ہیں جن سے اس بحث کے منفی پہلو کو تقویت پہونچتی ہے - چنانچہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے (جس کو علامہ خضری نے اپنی کتاب کی دوسری جلد میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے) کہ محمد بن حذیفہ نہ صرف حضرت عثمانؓ کے قریبی عزیز تھے بلکہ ان کے خاص پروردہ تھے - حضرت عثمانؓ نے

قبیلے کے دوسرے یتیموں کی طرح ان کی پرورش بھی بڑی محبت و شفقت سے کی تھی - لیکن بڑے ہوکر جب محمد بن حذیفہ نے حضرت عثمان سے کسی ولایت کی درخواست کی تو آپ نے سختی سے انکار کردیا - جس کی وجہ سے محمد بن حذیفہ ناراض ہوکر مصر چلے گئے اور وہاں کی شورش پسند جماعت سے وابستہ ہوکر حضرت عثمان کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہے - اگر حضرت عثمان کو صفتِ اقربا نوازی یعنی صلۂ رحمی (؟) اس قدر عزیز تھی جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے تو وہ محمد بن حذیفہ کو ولایت و امارت نہ سہی تو اسی قسم کا کوئی دوسرا عہدہ ضرور دے سکتے تھے - لیکن اب اس کو کیا کہئے کہ تاریخ - خلافتِ عثمانی کے متعلق اس قسم کے واقعات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے - اور پھر اگر بالفرض آپ کے اس جملہ کو تسلیم بھی کرلیا جائے کہ "عہدِ عثمانی میں بنو امیہ برسرِ اقتدار آگئے تھے" تو پھر اس پر ایک منطقی اور عقلی شبہ واقع ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر خلافتِ عثمانی میں بنو امیہ پوری طرح برسرِ اقتدار آگئے ہوتے تو خلیفۂ سوم کی شہادت (جو دراصل شہادت عظمیٰ تھی ؟) اس قدر دردناک طریقے سے واقع نہ ہوتی جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے -

آخر میں اگر میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے اس جملہ کو بھی یہاں نقل کردوں تو شاید بے جا نہ ہوگا جو انھوں نے اس سلسلہ میں عقلی و نقلی دلایل سے بحث کرتے ہوئے "تحفۂ اثنا عشریہ" میں تحریر فرمایا ہے - کہنے کو تو وہ ایک جملہ ہے لیکن درحقیقت اُس ایک جملے سے شاہ صاحب نے اِس گتھی کو بڑی خوبی سے حل کرنے کی کوشش کی ہے — فرماتے ہیں :-

"عزل و نصبِ عمال کارِ خلفاء و ائمہ است لازم نیست کہ عمالِ سابق را برقرار دارند"

دراصل یہ ایک یہودی تحریک تھی جس کا مقصد یہی تھا کہ کسی صورت سے اسلامی تاریخ کے دامنِ طہارت پر دھبہ لگایا جائے - خلافت راشدہ کے ابتدائی دور میں اس کو پنپنے کے مواقع نہ مل سکے تھے - فاروقی جاہ و جلال کے سامنے اس تحریک کی شانِ عنکبوتی محض خاکی راہ بن کر رہ گئی تھی - لیکن افسوس ہے کہ حضرت عثمان کی فرشتہ خصلتی یا ان کی سرشت کی ملکیت سے اس کو اُجاگر ہونے کے اچھے مواقع مل سکے - ابنِ سبا نے پورے ملک میں اسلام کے خلاف سازش کا ایک جال بچھادیا تھا اور مسلمانوں میں آپس میں پھوٹ ڈال کر، خلافت کے مشہور اور اہم صوبوں مثلاً مصر و شام، کوفہ و بصرہ وغیرہ میں اپنی جماعت کے مرکز قایم کردئے تھے - ان مرکزوں کے ذریعہ خلیفۂ وقت کے خلاف اُس نے جو کام لئے ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں - تاہم یہ ضرور ہے کہ باغیوں کے جس گروہ نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا تھا وہ اسی تحریک کے تاثر سے متاثر تھا - ابن سبا کے جماعتی مرکزوں سے شورش پسندوں نے خلیفۂ وقت پر اقربا نوازی اور عزلِ عمال کی تہمتیں لگا کر، حکومت کی بدنظمی کے خلاف ملک کے اطراف و اکناف کو جعلی خطوط بھیجے - جس سے پوری قوم نے یہ سمجھ لیا کہ گویا پورا ملک بنو امیہ کے مظالم سے نیم جان ہے - اس سے حضرت عثمان کی معصومیت، صالحیت اور طہارتِ قلب کو تو ضرور ملزم قرار دیا جاسکتا ہے - اگر دُنیائے انسانیت میں کسی بھی صالح انسان کی صالحیت کو مجرم قرار دینا جائز سمجھا جاتا ہو جبکہ دُنیا کے مختلف حصوں کی تاریخوں کے علاوہ خود خلافتِ راشدہ کے آخری دور میں بھی اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں - لیکن اس سے کسی بھی انسان کی شخصیت یا ذاتی عظمت پر حملہ کرنا کہاں تک درست ہے ؟ میں ابھی تک اس کا فیصلہ نہیں کرسکا -

(ب) آپ نے اسی سالنامہ ۵۵ء میں "بنو امیہ" کے باب میں تحریر فرمایا ہے کہ انہی کے عہد میں خوارج کی جماعت پیدا ہوئی - حالانکہ خارجی [illegible] عہدِ عثمانی سے شروع ہوچکی تھی - اور اگر غور سے دیکھا جائے تو مذہب کے باب میں ذہنی آزادی کی بنیادیں بھی عہدِ عثمانی میں مضبوط و مستحکم ہوچکی تھیں، نہ کہ بنو امیہ کے عہد میں، چنانچہ ابنِ سبا نے اس تخم کی آبیاری میں جو کارہائے نمایاں کئے ہیں، ان سے کون انکار کرسکتا ہے - کیا فتنۂ سبائیہ اسلام میں خارجی نظریات اور یزیدیت کی جڑ نہیں کہا جاسکتا ؟

(ج) آپ نے اسی نمبر میں "خطابت و شاعری" کے باب میں لکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ "اس سے قبل عرب شاعری صرف قصاید پر مشتمل تھی لیکن عہد امویین میں خالص عشقیہ شاعری شروع ہوئی" - پہلے جملہ میں لفظ "صرف" سے پوری عرب شاعری صرف قصیدے کے تنگ دائرے میں محدود ہوکر رہ گئی ہے - حالانکہ قصیدہ کے علاوہ عرب شاعری میں مرثیہ، ہجو، رجز، بہادری کے قصے، حرب لبوس، حرب داحس کے تذکرے، مناقر

و مقابلہ اور فخر و شجاعت کے اشعار بھی ملتے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت کی عرب شاعری کا ماحول ہی خود اس بات کا متقاضی تھا کہ ان کے اشعار میں قتل و جدال، عزم و شجاعت اور عشق و شراب کے مضامین آتے۔ چنانچہ "سبع معلقات" کے بیشتر قصاید اس تصور کی ضرب فارائی سے نہ بچ سکے۔ اس بناء پر اگر میں یہ کہوں تو نادرست نہ ہوگا کہ ان میں سے اکثر اشعار شعراء کی زندگی کے قصے اور واقعاتِ عرب کی داستانیں زیادہ ہیں۔ قصیدہ کم۔ خود اس کتاب کا پہلا ہی قصیدہ (اگر اس کو قصیدہ تسلیم کرلیا جائے) امرؤالقیس کی عشقیہ زندگی کے واقعات کی ایک منظوم شکل ہے نہ کہ کسی شخصیت کی مدح سرائی کا نقش فریادی۔

زہیر کا قصیدہ دراصل حارث بن عوف بن حارثہ مری اور ہرم بن سنان مری کے لئے لکھا گیا تھا۔ لیکن اس کے بیشتر اشعار حرب داحس وغبراء کے واقعات کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ جس سے قصیدہ کی فنیت کو بہت بھاری ضرب پہونچتی ہے۔ اس کے علاوہ اس قصیدہ میں زہیر کے عشقیہ رجحانات کے متعلق بھی لطف اشارات ملتے ہیں امرءالقیس کے بعد زہیر غالباً پہلا شاعر ہے جس کے ہاں عشق کا تصور امرءالقیس کی بہ نسبت زیادہ نکھرا ہوا، زیادہ پاک وصاف اور طاہر ہے۔

اوپر کی پوری بحث سے ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ قصیدہ کا وہ تصور جو انوری نے فارسی ادب کو اور سودا نے اُردو ادب کو دیا تھا عربی ادب میں تقریباً مفقود ہے۔ حسنیہ مدحیہ اشعار ضرور ملتے ہیں اور وہ بھی زیادہ تر اُن شعراء کے ہاں جو ملوکِ حیرہ اور آلِ غسان کے دربار سے وابستہ تھے۔ لیکن اس سے یہ تو کسی بھی صورت سے لازم نہیں آتا کہ ادبِ جاہلیہ کی پوری شاعری صرف قصیدے کی تنگ و تاریک حلقے میں مقید تھی۔ اول تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ خالص عشقیہ شاعری سے مراد کیا ہے۔ دوسرے، کہ عشق تو عرب شاعری کی ہمیشہ سے بنیاد رہا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر شعراءِ عرب کے دلوں میں عشق کی جلن، محبت کی کسک اور لذتِ درد سے لگاؤ نہ ہوتا تو آج ادبِ جاہلیہ کا پورا لٹریچر بے جان سا نظر آتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ زہیر بن سلمیٰ، مرقش الاکبر اور خنساء کے علاوہ امرءالقیس کو خصوصیت سے شعراء عرب میں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی عربی شاعر کو نصیب نہ ہوسکی۔ اور آج تک وہ عرب شاعری کی عظمت کا اعتراف فرماتے ہوئے اس کے بارے میں فرمایا ہے:۔ "ھوا شعر الشعراء و قایدھم الی النار"۔ اور اُس کی شاعری کی مقبولیت کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہ اپنے سینے میں ایک عشق پسند دل اور جمال دوست جذبۂ و احساس رکھتا تھا۔

دوسرے شعراء کے ہاں بھی حسن و عشق کے اس تصور کی مثالیں مل سکتی ہیں لیکن خالص عشق و وفا سپتی عشق کی اس بحث میں نہ معلوم اُن عاشق مزاج شاعروں کا کیا مرتبہ ہوگا، جن سے عرب کی چند حسین معشوقاؤں مثلاً عنیزہ (فاطمہ)، ام اوفی، ام رباب، سلمیٰ اور اسماء کے نام منسوب کئے جاتے ہیں۔ شاید ان لوگوں کے وہاں خالص عشق کے بجائے وفا سپتی عشق تھا؟

(و) اسی نمبر میں آپ نے "موسیقی" کے سلسلے میں تذکرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ "رسول اللہ نے شعر و غنا دونوں کے رواج کو روکا"۔ مخصوص آلاتِ غنا کی ممانعت کے سلسلہ میں تو احادیث ملتی ہیں۔ لیکن شعر کے متعلق کوئی منفی حدیث آج تک نظر سے نہیں گزری۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ میں پوری وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شعر کے متعلق کوئی بھی امتناعی صریحی حدیث صحیحہ نہیں ہے۔ البتہ شعر کے جواز میں کچھ احادیث ضرور ملتی ہیں۔ چنانچہ بخاری کی مشہور حدیث ہے:۔ "اِنّ من الشعر لحکمۃ و اِنّ من البیان لسحرا"[1]۔ امام بخاری کی صرف یہی ایک حدیث صحیحہ ایسی ہے جس سے شعر کے جواز اور اس کے رواج کا حتمی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر رسول پر شعر کے سلسلہ میں امتناعی احکام کا "الزام" لگایا جائے تو پھر اس کو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ "فھم لا یبصرون"

اس کے علاوہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کعب بن زہیر کے قصیدہ بانت سعاد کو سننے کے بعد حضور نے ان کو اپنی چادر مبارک عنایت فرمائی تھی۔

---

[1] اور یہ مقولہ بھی مشہور ہے:۔ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن"

حسان بن ثابت کے "اسلامی شاعر" ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے، احادیث سے ثابت ہے کہ جب وہ اشعار پڑھنے کھڑے ہوتے تھے تو حضور ان کے لئے منبر کو خالی فرما دیا کرتے تھے۔ حضور نے ان کو کفار کی ہجو لکھنے کا بھی بارہا حکم فرمایا تھا۔ احادیث میں یہ بھی صراحتاً موجود ہے کہ حسان بن ثابت کے متعلق حضور فرمایا کرتے تھے کہ حسان کے شعر دشمنوں کے دلوں پر وہی اثر کرتے ہیں جو تیر و نشتر انسان کے جسم پر۔ آپ نے حضرت حسان کے اشعار کو سن کر ان کے متعلق یہ دعا بھی فرمائی تھی کہ "ایدہ بروح القدس"۔ (بخاری)
اس کے علاوہ عہدِ جاہلیہ کے کتنے ہی اشعار ایسے ہیں جن کی سماعت حضور نے فرمائی تھی۔ چنانچہ صاحب مشکوٰۃ نے حضرت ابوہریرہ سے یہ حدیث روایت کی ہے، جس پر تمام محدثین متفق ہیں کہ حضور نے جب لبید بن ربیعہ کے ایک شعر کا یہ مصرعہ سنا تو آپ بہت مسرور ہوئے اور بار بار آپ اس کو دہراتے رہے ع "الا کل شیئ ماخلا اللہ باطل"۔
بہرکیف یہ وہ حقایق ہیں جن کی روشنی میں مسئلے کی صحیح پوزیشن سامنے آجاتی ہے۔ ان حقایق کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے یہ کیسے تسلیم کر لیا کہ حضور نے شعر گوئی یا اس کے رواج کو ممنوع قرار دیا تھا۔ "نگار" کی علمی عظمت سے اس قسم کی فروگزاشتوں کی توقع تو نہیں تھی۔ تاہم اچھا ہوگا اگر آپ کے نظریہ کی تاریکی کچھ ذرا واضح اور روشن شکل میں سامنے آجائے۔

(نگار) آپ کا مقالہ پڑھکر مجھے بہت خوشی ہوئی، اس لئے نہیں کہ اس سے مجھے اتفاق ہے، بلکہ محض اس بنا پر کہ آپنے نگار کے سالنامہ کو غور سے پڑھا اور اس کے مطالعہ کے بعد آپ نے آزادی سے اپنی رائے ظاہر کی۔
آپ نے چار اعتراضات کئے ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم اور کافی جوشیلا اعتراض وہ ہے جو حضرت عثمان سے تعلق رکھتا ہے اور سب سے پہلے میں اسی پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔
آپ کے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان پر "اقربا نوازی" کا الزام صحیح نہیں اور اس بات کا محرک غالباً یہ خیال ہے کہ اس طرح ان کا کیرکٹر داغدار ہو جاتا ہے اور اس بات کے تسلیم کرنے کو آپ کا جی گوارا نہیں کرتا۔ اس سلسلہ میں زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحث کے دو ٹکڑے کر کے دو جداگانہ تنقیحیں قایم کر دی جائیں۔ ایک یہ کہ حضرت عثمان نے اقربا نوازی سے کام لیا یا نہیں اور دوسرے یہ کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو کیا واقعی اس سے ان کی دیانت و امانت پر کوئی حرف آتا ہے؟

تنقیح اول کے سلسلہ میں سب سے پہلے (اگر آپ میرے ساتھ ہوتے) آپ ہی سے یہ دریافت کرتا کہ حضرت عثمان کا زمانہ امن و سکون کا زمانہ تھا یا عہد تشتت و انتشار کا، یعنی مسلمانوں کے تمام مفتوحہ دیار و امصار میں کوئی صحیح اجتماعی روح ایسی پائی جاتی تھی یا نہیں اور کیا یہ تمام منتشر علاقے واقعی مرکز خلافت کے مطیع و فرمانبردار تھے؟ - غالباً آپ کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا کہ فتوحات اسلامی کے ساتھ ساتھ خود حضرت عمر کو بھی یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ مسلمانوں میں قبایلی یا جماعتی اختلاف پیدا ہوتا جا رہا ہے اور اس کی روک تھام کے لئے انھوں نے مختلف تدابیر سے کام لینا شروع کر دیا تھا جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ جب حضرت عمر کے انتقال کے بعد حضرت عثمان کا دورِ خلافت آیا تو اس زمانہ میں بعض ایسے عسکری اقدامات بھی تکمیل کو پہونچے جن کا آغاز حضرت عمر کے زمانہ میں ہوا تھا اور اس طرح فتوحات کا سلسلہ وسیع تر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ جماعتی و سیاسی اختلافات بھی زیادہ بڑھنے لگے جن کی بنا حضرت عمر کے زمانہ میں پڑ چکی تھی۔ پھر اگر یہ اختلافات صرف مذہبی یا خالصتہً للہ ہوتے تو بھی غنیمت تھا، لیکن وہاں تو یہ تمام سرگرمیاں محض دنیاوی اغراض اور حصول جاہ و دولت سے تعلق رکھتی تھیں اور برابر بڑھتی ہی جا رہی تھیں، یہاں تک کہ حضرت عثمان کے عہد میں اسلام کا قایم کیا ہوا ذہنی و جسمانی اتحاد بہت زیادہ متزلزل ہو گیا اور کھلم کھلا مرکز خلافت کے خلاف صدائے احتجاج بلند

ہونے لگی - بہرحال اس سے انکار ممکن نہیں کہ بنو امیہ اور مہاجرین و انصار کے چند افراد کو چھوڑ کر سبھی حضرت عثمان کے خلاف تھے اور ان کے خلاف شکایتوں کا ایک دفتر کھل گیا تھا - میں ان تمام شکایات کا ذکر یہاں غیر ضروری سمجھتا ہوں - (محب الدین الطبری کی تصنیف " الریاض النادرہ فی مناقب العشرہ" میں نہایت تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے)، لیکن سب سے بڑا اعتراض جس کا تعلق موضوع زیر بحث سے ہے، یہی تھا کہ حضرت عثمان کے عہد میں سب نہیں تو اکثر اہم صوبوں کے گورنر انھیں کے اعزہ و اقربا یا افراد بنی امیہ تھے (عام اس سے کہ وہ پہلے ہی سے اس عہدہ پر مامور رہے ہوں یا خود حضرت عثمان نے انھیں مامور کیا ہو) اور وہ دوسرے قبایل کی حق تلفی کر رہے تھے -

آپ نے ان چند صوبوں (مثلاً یمن و صنعاء وغیرہ) کا ذکر تو کر دیا جو کوئی مخصوص اہمیت نہ رکھتے تھے، لیکن کوفہ و بصرہ اور مصر و شام کے متعلق جو خاص عسکری مرکز تھے صرف سرسری ذکر کر دینا کافی سمجھا - ہر چند شام میں امیر معاویہ پہلے ہی سے گورنری کی خدمت پر مامور تھے اور حضرت عثمان نے ان کا تقرر نہ کیا تھا لیکن تھے بہرحال حضرت عثمان کے قبیلۂ بنی امیہ ہی میں سے - بصرہ میں ابو موسیٰ الاشعری اور کوفہ میں سعد بن ابی وقاص عہد فاروقی کے گورنر تھے، لیکن حضرت عثمان نے انھیں ہٹا کر عبداللہ بن عامر اور ولید بن عقبہ کو گورنر مقرر کیا اور یہ دونوں حضرت عثمان کے عزیز تھے - بعد کو جب ولید بن عقبہ ایک خاص بدنامی کی وجہ سے ہٹائے گئے تو ان کی جگہ سعید بن العاص کو گورنر مقرر کیا جو بنو امیہ میں سے تھے - مصر میں عمر بن العاص کو جنھوں نے مصر فتح کیا تھا اور وہاں کی گورنری کے لئے بہت موزوں تھے، ہٹا کر عبداللہ بن سعد کو گورنر مقرر کیا جو حضرت عثمان کے رضاعی بھائی تھے - اور ان تمام گورنروں کے عہد میں بنو امیہ اپنے اعزہ و اقربا کے لئے غیر معمولی اکرام سے کام لیتے تھے جس سے عام طور پر بنو ہاشم کو شکایت کا موقع مل گیا تھا - اسی کے ساتھ ایک بڑا اعتراض لوگوں کو بھی یہ تھا کہ حضرت عثمان نے مروان بن الحکم کو جو ان کے نہایت قریب کے عزیز تھے، اپنا سکرٹری مقرر کر لیا تھا اور ان کا اتنا اثر تھا کہ تمام امور خلافت انھیں کی رائے سے طے پاتے تھے، حالانکہ ان کو کوئی دینی اہمیت حاصل نہ تھی - الغرض یہ تھیں وہ تمام باتیں جن کی بنا پر حضرت عثمان کو "اقربا نواز" کہا جاتا ہے -

اب دوسری تنقیح کی طرف آیئے کہ کیا حضرت عثمان کی اقربا نوازی کوئی ایسا فعل تھا جس سے ان کی امانت و دیانت یا خلوص نیت پر حرف آسکتا ہے -

اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمان نے امور خلافت و انتظام مملکت میں بنو امیہ کے درخور کے ذمہ دار تھے، لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا اس کے سمجھنے کے لئے خلافت فاروقی کی تاریخ کے کچھ اوراق پلٹنا پڑیں گے -

یہ بات خود عمر نے محسوس کر لی تھی کہ مفتوحہ علاقوں کے گورنروں میں خود سری کے آثار پیدا ہو چلے ہیں اور وہ یکجہتی جو ابتداء اسلام میں پائی جاتی تھی کم ہوتی جا رہی ہے - لیکن حضرت عمر کی حکمت عملی و وجاہت کی وجہ سے یہ بات آگے نہ بڑھنے پائی، جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بھی بالکل وہی پالیسی اختیار کرنا چاہی جو حضرت عمر نے اختیار کی تھی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے - آپ کے خلیفہ ہوتے ہی بنو امیہ کی بہت سی خوابیدہ تمنا بیدار ہو گئیں اور وہ آپ کی نیکی سے ناجایز فایدہ اٹھانے لگے - خود حضرت عثمان کے سامنے کوئی سوال بنو امیہ اور بنو ہاشم کی تفریق و امتیاز کا نہ تھا اور آپ نے قصداً کوئی بات ایسی نہیں کی جس سے بنو امیہ کے ارادے بلند اور بنو ہاشم کے پست ہو جاتے - آپ اپنی طرح ہر مسلمان کو ایماندار اور صاف دل سمجھتے تھے اور چونکہ آپ خود بنو امیہ کے ایک فرد تھے اس لئے سمجھتے تھے کہ میرا اثر ان پر زیادہ ہوگا اور اگر انتظام ان کے سپرد کر دیا گیا تو بہتر طریق سے انجام دیں گے - حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سرداران بنی امیہ کو آپ سے اسی حد تک دلچسپی تھی کہ وہ آپ کی ذات سے فایدہ اٹھاتے رہیں، اس سے آگے انھیں حضرت عثمان سے کوئی تعلق نہ تھا -

آپ نے یہ عجیب بات لکھی کہ اگر خلافتِ عثمانی میں بنو امیہ پوری طرح برسر اقتدار آگئے ہوتے تو خلیفہ سوم کی شہادت نہ ہوتی حالانکہ شہادت ہی اس لئے ہوئی کہ بنو امیہ برسر اقتدار آگئے تھے اور لوگوں میں ان کے جور و ستم کی وجہ سے جو غصہ بڑھ گیا تھا اس کا نشانہ حضرت عثمانؓ کو بننا پڑا، اب رہی بنو امیہ کی دلچسپی حضرت عثمانؓ کے ساتھ سو اس کا حال یہ تھا کہ جب حضرت عثمانؓ پر دشمنوں کا زور ہوا تو امیر معاویہ نے ایک لشکر انکی مدد کیلئے روانہ کیا لیکن جب راستہ میں یہ معلوم ہوا کہ آپ شہید ہو چکے ہیں تو وہیں سے لوٹ گیا اور کوئی جذبہ طیش و انتقام کا اس میں پیدا نہ ہوا۔

آپ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ایک جگہ شاہ عبدالعزیز صاحب کا بھی قول نقل کیا ہے، حالانکہ خود اسی سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانہ میں کافی عزل و نصب سے کام لیا جس کو آپ تسلیم نہیں کرتے۔

آپ نے اسی سلسلہ میں عبداللہ ابن سبا کا بھی ذکر ہے اور آپ کا خیال ہے اسی کے پروپیگنڈے نے لوگوں کو حضرت عثمانؓ کا مخالف بنا دیا تھا اور بنو امیہ کے مظالم سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ حالانکہ یہ عثمانؓ ہی کے زمانہ میں اسلام لایا تھا اور بعد کو جب مذہبی جنون کا دورہ اس پر پڑا تو "رسول اللہ کی رجعت" کا نظریہ پیش کرکے اس نے چند ساتھی پیدا کرلئے جن کا کوئی خاص اثر ممالک اسلامی میں نہ تھا۔ اس کی غیر اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود حضرت علیؓ نے جن کو وہ رسول اللہ کا وصی تسلیم کرتا تھا اسے منہ نہ لگایا اور مدائن کی طرف نکال دیا۔ حیرت ہے کہ آپ ایسے شخص کو تمام اضطراب و انتشار کا سبب بتاتے ہیں اور سرداران بنی امیہ کی امارت کوششوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

(ب) آپ نے "ظہور خوارج" کے زمانہ کی تعیین میں بھی مجھ سے اختلاف کیا ہے اور عبداللہ بن سبا کو اس کا اصلی اصل قرار دیتے ہیں حالانکہ خوارج جنگ صفین کے بعد وجود میں آئے۔ حیرت ہے آپ عبداللہ ابن سبا کی ہستی میں ذہنی آزادی کی جستجو کرتے ہیں، حالانکہ وہ حد درجہ پست و پلید ذہنیت کا انسان تھا اور اسی لئے اس کی تحریک "رجعتِ رسول" جو تناسخ کی دوسری صورت تھی کامیاب نہ ہو سکی۔

(ج) میری مراد قصاید سے، قصاید کا تکنک ہے جو عرب شاعری میں شروع سے ایک سا چلا آرہا تھا۔ عرب شاعری کسی وقت سے بھی شروع ہوئی ہو لیکن ہم تک جو معلومات پہونچی ہیں وہ رسول اللہ سے صرف ۱۵۰ سال قبل تک کی شاعری سے تعلق رکھتی ہیں جو سب قصیدہ ہی کہلاتی ہیں۔ عربی میں ہر طویل نظم کو قصیدہ کہتے تھے ۔ اس کا مادہ قصد ہے جس کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں، چونکہ ان نظموں سے شعراء کا مقصود یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے قبایل کی تعریف اور دوسرے قبایل کی ہجو کریں، اس لئے اس نوع کی نظموں کو وہ خود بھی قصیدہ ہی کہتے تھے، ان سب کی تکنک ایک سی ہوتی تھی اور الفاظ کے ردوبدل کے سوا ترتیب میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ قصیدے کے تین حصے ہوتے تھے۔ پہلے حصہ میں عموماً وہ اپنی محبوبہ کی سرزمین کا ذکر کرکے اس پر آنسو بہاتا تھا، اس کے بعد وہ ریگستان سفر کی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اونٹ کی تعریف کرتا تھا، اخیر میں وہ قصیدہ کے اس حصہ پر پہونچتا تھا جو کسی کی مدح یا ہجو پر ختم ہوتا تھا کبھی کبھی وہ اس سلسلہ میں ایام عرب کے قصے بھی بیان کر جاتے تھے، لیکن ان کو بھی وہ قصیدہ ہی کہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر شعراء نے اپنے قصاید کی ابتداء جذبات محبت ہی سے کی ہے، لیکن وہ تمام تر روایتی چیز ہے اور کسی شاعر کی انفرادیت اس سے نمایاں نہیں ہوتی ۔ مرثیہ البتہ قصیدہ سے علیحدہ چیز تھا لیکن اس کی تکنک بھی روایتی تھی۔

ابن رشیق کی زبردست انتقادی اہلیت سے آپ بھی واقف ہوں گے، پھر اس کی کتاب عمدہ اٹھا کر دیکھئے اور مجھے بتایئے کہ اس نے کتنے شاعروں کی حداثت فن و بداعت شعری کی تعریف کی ہے۔

عشقیہ شاعری سے میری مراد خالص غزلیہ شاعری یا نغمات (گیتوں) سے ہے، جس سے ہر شاعر کی جذباتی انفرادیت نمایاں ہو سکے اور جو قصاید کی پامال راہ سے علیحدہ ہو اور یہ چیز آپ کو اموی دورِ خلافت ہی کے بعض شعراء میں نظر آئے گی۔ مثلاً عمر بن ابی ربیعہ

حارث بن خالد، عبداللہ بن قیس الرقیہ اور عبداللہ بن عمر العرجی -

ولید بن عبدالملک کے عہد میں وضاح دمشق میں بیٹھ کر، روضہ اور خلیفہ کی بیوی سے اظہار عشق کرتا ہے اور اپنی جان کھو دیتا ہے - خود خلیفہ ولید اپنی سالی سلمیٰ کے عشق میں مبتلا ہو کر نغمات محبت پیش کرتا ہے اور بدنام ہو جاتا ہے - شاعری کا یہ رنگ جو قصیدہ کی ٹکنک سے بالکل علحدہ محض نغماتی حیثیت رکھتا تھا، امویین ہی کے زمانہ میں پیدا ہوا - اس سے قبل شعراء عرب کے قصاید میں اگر کہیں کہیں اظہار عشق کیا جاتا تھا تو وہ بالکل ضمنی چیز تھی یا محض ایسے پس منظر کی حیثیت رکھتی تھی جو اصل نقش سے بعد کو بالکل بے تعلق نظر آتا تھا۔

(د) یہاں تک تو آپ کے اعتراضات دلچسپ تھے اور میں نے دلچسپی سے جواب بھی دیا، لیکن آپ کے چوتھے اعتراض نے بدمزہ کر دیا۔ خود آپ ہی نے امرؤ القیس کے متعلق رسول اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہو قائدہم الی النار" اور پھر بھی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے شعر و غنا کو پسند فرمایا ہے - علاوہ اس کے آپ نے شعر کی حمایت میں بخاری کی حیثیت تو پیش کر دی لیکن قرآن کا ارشاد "ما علمناہ الشعر" اور "والشعراء یتبعہم الغاوون" یاد نہ آیا - جایئے آپ بھی بخاری کے مارے ہوئے نکلے -

رعایتی قیمت

تصانیف نیاز فتحپوری

رعایتی قیمت

من و یزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — جمالستان — نگارستان — شہوانیات -
مغہ ۸ صہ ۵ للعہ ۴ للعہ ۴

مکتوبات نیاز تین حصے — انتقادیات — حسن کی عیاریاں — مالہ و ماعلیہ — شہاب کی سرگزشت
عع ۱۲ للعہ ۴ ع ۲ ع ۲ ع ۲

فلاسفۂ قدیم — مذاکرات نیاز — فراست الید — مذہب — نقاب اٹھ جانے کے بعد —
عہ ۱ عہ ۱ عہ ۱ عہ ۱ ۸ ۱

میزان
صہ ۵۳

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں

نیجر نگار لکھنؤ

داستانِ شاہین و کنجشک

ادارۂ فحاشی اور مرد
(ایک لڑکی کسبی ہو جانے کے بعد)

پہلا خط :-

نیاز صاحب ، سب کہتے ہیں کہ کسبی بُری ہے لیکن خدا کے لئے مجھے یہ بتلا دیجئے کہ ان کہنے والوں میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں کم از کم دو چار معصوم لڑکیوں کو کسبی نہ بنایا ہو، جائیے اور ان کی زندگیوں کو ٹٹول کر دیکھئے کہ ان کے چچا اور پھوپھی کی لڑکیاں، ان کے گھر میں آنے جانے والیاں، ان کے گھر کی خادمائیں، ان سے پڑھنے والی بچیاں — غرض کہ کتنی ہیں جن کو یہ "معصوم فرشتے" محبت اور خلوص کے نام پر، ادب و شاعری کے نام پر، نکاح و شادی کے نام پر، بلند ذوقی اور رومانیت کے نام پر، رشتہ داری اور قرابت کے نام پر، مستقبل کی خوشگوار توقعات کے نام پر — دن رات رومالوں، ناولوں، شب ناچوں، انگوٹھیوں اور ساریوں کے تحفے پیش کر کر کے "کسبی" بناتے رہتے ہیں !!

نیاز صاحب، کون ماں کے پیٹ سے افلاطون اور ارسطو بن کر پیدا ہوتا ہے ! لڑکی کا بھی یہی حال ہے۔ پھر اگر وہ خاموش، شرمناک اور بالکل سادہ ہو، داغ اور جلیل کے اشعار کو نہ سمجھتی ہو اور نہ پڑھتی ہو تو "تعلیم یافتہ" نوجوان کی نظروں میں وہ "منہ لگانے" کے قابل نہیں۔ اور اس لئے فطرتاً والدین کے کندھوں پر ایک مستقل عذاب — لیکن اگر وہ ذہین ہے، طباع ہے، چست و چالاک ہے تو پھر اس کا وہ حشر ہوتا ہے جو ابھی عرض کیا گیا۔

نیاز صاحب، میں اپنی داستان لے کر بیٹھنا نہیں چاہتی لیکن اتنا کہوں گی کہ مجھے میری زندگی کے بارھویں سال سے جس نے "کوٹھوں" پر بھیجنے کے لئے طیار کیا وہ میرا "روحانی باپ" تھا اور میرا "خالہ زاد بھائی"۔ میرے سامنے زندگی کو جس طرح پیش کیا گیا اسی طرح سمجھنا چاہئے تھا۔ حتیٰ کہ خواب ختم ہوا، آنکھ کھلی اور میں تنہا تھی !!

مسجدوں کے مُلّا، کالجوں کے طلبہ، اخباروں کے اڈیٹر، ادیب، انشا پرداز، شاعر، واعظ، بڑے اور چھوٹے — یہ سب چاہے آپس میں کتنے ہی مختلف الخیال کیوں نہ ہوں لیکن "عورت" کو درجہ بدرجہ اس انحطاط تک پہونچانے میں ایک حیثیت سے ایک دوسرے کے شریک ہیں۔

نیاز صاحب ، یہ کسی کو بُرا کہنے والے کبھی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی غور کرتے ہیں کہ ان کے قبا کے دامن میں کتنی کسبیاں چھپی ہیں اور یہ معصیت سے روکنے والے راست کردار، کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ دن رات کتنی لڑکیوں کو (حسب استطاعت) اپنی نظروں، گفتگوؤں، شعروں، مضمونوں اور خطوں سے دن رات زینت آغوش بنانے کی سعی کرتے رہتے ہیں — خدا کی قسم یہ جھوٹے ہیں، اگر ان کا بس چلے تو پہلے یہ ساری کائنات کو لڑکی بنا دیں اور پھر ہر لڑکی کو کسبی۔

نیاز صاحب، آپ خفا ہوں گے کہ ایک لڑکی اور اتنی منہ پھٹ، لیکن آپ کو کیا معلوم کہ میں نے کتنی مرتبہ آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کیا اور پھر نہ معلوم کن کن چیزوں سے ڈر کر رُک گئی۔ اور اب جو لکھ رہی ہوں تو کتنی رُک رُک کر۔

نیاز صاحب، آپ کسی طرح میری حالت کا صحیح تصور نہیں کر سکتے۔ دُنیا کا ہر قریب و بعید انسان ہم کو کسی نہ کسی طرح "کھانا چاہتا ہے" اور پھر کھا لینے کے بعد ہم سے اس لئے نفرت کرتا ہے کہ اس نے ہمیں کیوں کھایا۔"

(نگار) جس حد تک آپ کے ذاتی حالات و واقعات کا تعلق ہے میں سوا اس کے کیا عرض کر سکتا ہوں کہ یقیناً آپ پر بہت ظلم کیا گیا، لیکن سوال یہ ہے کہ ان تمام بلند شریفانہ احساسات کے نشو و نما پانے کے بعد آپ نے عملاً احتجاج کی کوئی صورت اختیار کی یا نہیں اس میں شک نہیں کہ ایک انسان کسی مخصوص ماحول میں عرصہ تک زندگی بسر کرنے کے بعد، کچھ ایسا مجبور ہو جاتا ہے کہ نہ اُس ماحول سے علٰحدہ ہونے کی جرأت اس میں باقی رہتی ہے اور نہ سوسائٹی کی طرف سے ہمت افزائی ہوتی ہے، تاہم انسانی آبادی میں اگر سو شیطان ہیں تو دو چار انسان بھی مل جاتے ہیں اور متعدد مثالیں اس امر کی ملیں گی کہ آپ سا احساس رکھنے والی عورتوں کا جواب کافی ایثار و ہمدردی سے دیا گیا، بہرحال یہ آپ کے مخصوص حالات ہیں اور ان کے متعلق میں یا کوئی کیا کہہ سکتا ہے جب تک پورا علم نہ حاصل ہو۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ سوسائٹی کی عام اخلاقی حالت کا جو اندازہ آپ نے کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور پیشہ ور عورتوں سے کہیں زیادہ قابل الزام وہ مرد ہیں جو بظاہر نہایت مہذب و شائستہ، حد درجہ شریف و نستعلیق نظر آتے ہیں، لیکن اپنے اخلاق کے لحاظ سے حقیقتاً وہ بھیڑئے ہیں جو بھیڑ کی کھال اوڑھے ہوئے آہستہ آہستہ سماج میں ہلاکت پھیلا رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مرد، عورت کا تعلق بالکل فطری چیز ہے اور چونکہ اس تعلق میں مرد کے اندر قدرتاً ایک ہلکی سی کیفیت عجز و افتادگی کی پیدا ہوتی ہے، اس لئے آج نہیں، بلکہ عہدِ وحشت ہی میں مرد نے اپنی اس جذباتی کمزوری کو اپنی جسمانی قوت سے پورا کرنا چاہا اور باوصف اس کے کہ اس کی روح عورت کے لئے یکسر التماس و سوال تھی، اس نے اپنے اعصاب کی قوت، ہاتھ پاؤں کی مضبوطی، اور پہاڑ کھانے والی جسمانی طاقت کا مظاہرہ کر کے، اپنے اس عجز کو کبھی عورت پر ظاہر ہونے نہیں دیا اور اس کے اندر ہمیشہ یہ غلط احساس پیدا کیا کہ وہ مرد کی حفاظت کی محتاج ہے، اور تنہا کچھ نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد جب ذہنی و تمدنی ترقی وسیع ہوئی تو مرد کا یہ احساس بھی اس کے ساتھ بڑھتا رہا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلے عورت کو مجبور و پابند رکھنے کے لئے کوئی خاص قاعدہ نہ تھا، اور اب اس نے عورت کو شکنجہ میں کس نے اور اپنے آپ کو آزاد رکھنے کے لئے آئین و قانون وضع کرنے شروع کئے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرونِ ماضیہ میں ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب عورت برسرِ اقتدار تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس کا ثبوت ان دیویوں کا وجود ہے جو عہدِ قدیم کے صنمیات میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ قیاس درست نہیں۔ کیونکہ عہدِ وحشت کے مرد کا کسی دیوی کی پرستش کرنا حقیقتاً صرف احساسِ عجز کے بنا پر تھا جو فطری طور پر عورت کے مقابلہ میں اُس کے اندر پایا جاتا تھا، لیکن جس حد تک کاروبارِ دنیا کا تعلق ہے اس نے ہمیشہ اپنی ہی پرستش عورت سے کرائی اور اپنی خواہشات کے مقابلہ میں اس کے جذبات کی کبھی پروا نہیں کی۔ عورت کی رضامندی حاصل کئے بغیر اس کو بیوی بنا لینا، ایک ہی وقت میں متعدد مردوں سے تعلق رکھنے پر مجبور کرنا، جب چاہنا پھوڑ دینا اور جب جی میں آئے قیمت ادا کر کے دوسری عورت لے آنا، اور اس سے بھی زیادہ ماں بہن کی تمیز اُٹھا دینا، یہ سب مرد ہی کے قابلِ فخر کارنامے ہیں اور تاریخِ عالم میں کوئی زمانہ عورت پر ایسا نہیں گزرا جب خود اس نے ان بدتمیزیوں کی ابتدا اپنی طرف سے کی ہو۔ اس کے ساتھ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ پہلے تو خود اسی نے عورتوں کی آبروریزی کی خود ہی ان کو عصمت فروشی پر مجبور کیا۔ اور پھر انکو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا آج مرد "اداراۂ فحاشی" کو انسانیت کے لئے ذلت و لعنت قرار دیتا ہے، ملی تباہیوں کا ذمہ دار پیشہ ور عورتوں کو قرار دیتا ہے، گروہ بیماریوں اور نسلی خرابیوں کا سبب کسبیوں کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ یہ لعنت اسی کی لائی ہوئی ہے، یہ بربادیاں اسی کے ہاتھوں نے پیدا کی ہیں اور یہ جسمانی داغداریاں خود اسی کے وحشیانہ جذبات کا نتیجہ ہیں۔ اگر آج کوئی شخص اس تحقیق میں کامیاب ہو جائے

کہ دنیا میں کس مخصوص خاندان یا قبیلہ سے فحاشی کی ابتدا ہوئی تو یقیناً اس خاندان یا قبیلہ کی سب سے پہلی وہ عورت جس نے اول اول فحاشی اختیار کی ہوگی وہی ہوگی جسے پہلے مرد نے خراب کیا ہوگا اور پھر بعد کو غارتِ حسن و شباب کے بعد ذلت کی زندگی بسر کرنے کے لئے گھر سے باہر نکال دیا ہوگا۔

ایک معلم اخلاق احتجاج کرتا ہے کہ کسبیوں کے وجود سے دنیا کو پاک کر دینا چاہئے، لیکن اگر ہمارے کان ہوں تو ہم سنیں کہ عورت کی فریاد کیا ہے اور وہ کس کس طرح مرد سے پناہ مانگ رہی ہے جسنے اسے کسبی بننے اور کسبی رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ایک ڈاکٹر، قوم کے نوجوانوں کی بیماریوں کا سبب پیشہ ور عورتوں کو بتا کر ان کے فنا کر دینے کا مشورہ دیتا ہے۔ حالانکہ اصولاً وہ خود مردوں کے مٹا دئے جانے کا مطالبہ کر سکتی ہیں جنھوں نے ان کو یہ تمام بیماریاں لگائیں اور جو تمام تر ان کی اور اپنی خرابیٔ صحت کے ذمہ دار ہیں۔

آپ نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے مجھے حرف بحرف اتفاق ہے، اور اس میں مطلقاً شک کی گنجایش نہیں کہ وہ لوگ جو آج عمر ڈھل جانے کے بعد اپنے آپ کو بڑا پُرجوش معلم اخلاق کہتے ہیں، حقیقتاً وہی ہیں، جن کی جوانی سب سے زیادہ ناپاک بسر ہوئی ہے اور جنھوں نے خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھ کر تختۂ بازار پر بیٹھنے والی کسبیوں سے زیادہ ادارۂ فحاشی کے رواج میں مدد دی ہے۔

بہرحال ماضی کے استبداد نے جو طرح جور و ستمرانی کی ڈالدی ہے اس کے اثرات تو اب مٹ نہیں سکتے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ مرد جو پہلے علانیہ عورت کی عصمت کو خراب کر دیتا تھا، اب چوری چھپے بھی یہ حرکت نہ کرے، لیکن اس دور میں ایک انقلاب ضرور آنے والا ہے جو یقیناً فحاشی کا محو کرنے والا تو نہ ہوگا، لیکن اس کی نوعیت کو بدل کر مرد سے اس کی گزشتہ تخریب اخلاق کا انتقام عورت کی طرف سے لیکر رہے گا۔

عورت جب تک جاہل تھی، نہ وہ اپنے جایز حقوق سے آگاہ تھی نہ ان عطایا و فطرت سے جو مرد ہی کی طرح اس کی خلقت میں بھی ودیعت کئے گئے تھے۔ لیکن اب کہ وہ اپنی اہمیت اور اپنی دماغی صلاحیت سے واقف ہو گئی ہے وہ مرد سے بے نیاز ہوتی جا رہی ہے اور اپنا وجود علٰحدہ قایم کر کے مرد کے جذبات اسی طرح ٹھکرا دے گی، جس طرح اب سے قبل مرد کیا کرتا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو کبھی جدید تعلیم یافتہ عورت کے مطالعہ کا موقع ملا ہے یا نہیں، لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے چونکہ مجھے روز اس کی فرصت نصیب ہو جاتی ہے اس لئے میں جانتا ہوں کہ وہ مرد سے گزشتہ مظالم کا انتقام کس کس طرح لے رہی ہے اور وہی مرد جو پہلے عورت کی زرا سی بدعنوانی پر تیغ خارا شگاف لے کر کھڑا ہو جاتا تھا اب اس کے سینہ پر عورت کیسی کیسی چھریاں چلا رہی ہے اور وہ ہے کہ خون کے سے گھونٹ پی پی کر رہ جاتا ہے۔ اس نے مرد کے بنائے ہوئے قانونِ اخلاق کو پارہ پارہ کر کے رکھدیا ہے، اس نے مرد کے تراشے ہوئے آئینِ شرم و حیا کو ٹھکرا کر اس کے منہ پر کھینچ مارا ہے اور اب وہ مرد کے کام و دہن کو ان تمام تلخیوں کے گوارا کرنے پر مجبور کر رہی ہے جو کسی وقت عورت کو گوارا کرنے پڑے تھے — الغرض اب عورت آزاد ہے، جسمانی و اخلاقی دونوں حیثیتوں سے، پہلے وہ مرد کا کہنا ماننے پر مجبور تھی کیونکہ کسبِ معاش میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا، لیکن اب کہ وہ مردوں کے دوش بدوش ہر کام پر آمادہ ہے اور اپنی پروبالی کی بندشیں علٰحدہ کر چکی ہے، اپنا قانون اخلاق و معاشرت خود علٰحدہ بنائے گی اور مرد کو اس کی پابندی پر مجبور ہونا پڑے گا، خواہ اس کو کتنے ہی "جورِ رقیب" کے صدمے کیوں نہ اُٹھانا پڑیں — پھر آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا — جب عورت کی آزادی کی انتہا ہو جائے گی جب سارا عالم موجودہ اصول اخلاق کے لحاظ سے یکسر ادارۂ فحاشی ہو کر رہ جائے گا، جب عورت کی وفاداری و عصمت کا مفہوم سوا اس کے کچھ نہ ہوگا کہ وہ کسی کی طرف مایل ہے اور کسی کی طرف نہیں — اُس وقت مرد، مجبور و ذلیل مرد، اخلاق و معاشرت کا ایک جدید قانون مرتب کرے گا، جس میں نہ رشتۂ ازدواج کوئی چیز رہے گا، نہ ضبطِ نفس و جذبات، دنیا ایک فردوس ہوگی "خیالی" نہیں "عملی"، احساسی، بیتی جاگتی — جہاں عورت مرد کے ساتھ کھیلتی رہے گی جب تک اس کا جی چاہے اور مرد عورتوں کے ساتھ کھیلتا رہے گا جب تک عورت اس کی اجازت دے — پھر اس زندگی کے جدید نظریے قایم ہوں گے، بہت سی نفسیاتی پاکیزگیوں کا وجود ان میں ثابت کیا جائے گا — اور — ہر چند اس وقت بھی مردوں میں اتنی جرأت تو نہ ہوگی کہ وہ اپنی عورتوں کو کسبی کہہ سکے، لیکن کسبیوں کے سامنے اپنی آغوش کھول کر یہ کہنے میں اس کو مطلق دریغ نہ ہوگا کہ :-

"بیا بیا عراقی تو زخاصگان مائی"

دوسرا خط :-

نیاز صاحب ! - آپ کی تحریر سے ایک خاص قسم کا عتاب ٹپکتا ہے - مجھے افسوس ہے کہ میں کیوں آپ کے لئے وجہ تفکر بنی - آپ کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن خدا کی قسم میں نے آپ کو جو کچھ لکھا تھا وہ صرف میرے دل کی تڑپ تھی - جو بے ساختہ قلم سے نکل پڑی تھی - زندگی میں اگر ایسی حماقتیں سرزد نہ ہوں تو قسمت کو کون روئے -

نیاز صاحب ! آپ فرماتے ہیں کہ میں اپنا نقاب چاک کرکے دوسری جنس کو تلافی کا موقع دوں - لیکن خدارا مجھے یہ بتلا دیجئے - کہ کیا ان "ہمدردوں" کے لئے ہندوستان کے کروروں کمزور بے زبان متحرک مجسموں میں صرف ایک میں ہی ہمدردی کی مستحق رہ گئی ہوں - للہ ان سے پوچھئے کہ وہ اپنے شہر، اپنے محلے، اور اپنے گھر میں ان بیسیوں تڑپتی ہوئی لاشوں کی طرف نظر کیوں نہیں کرتے جو صرف انھیں کی بے اعتنائیوں اور کم نگاہیوں کا شکار بنی موت کی سسکیاں لے رہی ہیں - ؟ — وہ ہزاروں شوہر جنھوں نے اپنی نظرِ التفات کا جائز یا ناجائز مرکز دوسری عورت کو بنا کر ایک معصوم مورتی کو رُلا رکھا ہے - وہ بے شمار نوجوان جو سینکڑوں جھوٹے وعدوں کے ساتھ عورت کا سب کچھ لوٹ کر بے اعتنائی کے ساتھ احباب کی مجلسوں میں بیٹھے سرگرم عشرت ہیں - وہ ہزاروں "بلند ذوق" لڑکے جو مقصود حاصل کرنے کے بعد والدین کی اطاعت اور اخلاق کی پاکیزگی کی آڑ میں اپنے شکار کو تڑپتا چھوڑ چکے ہیں - وہ بیسیوں بلند حوصلہ طلبہ جو ادیبانہ انداز سے تقریر و تحریر میں اپنے اسیروں کو لوٹ چکنے کے بعد "تعلیمی مشغولیت" کے پردے میں شادی سے ہمیشہ کے لئے انکار کر چکے ہیں — ہاں تو یہ سوسائٹی کے "ہونہار سپوت" اگر تلافی کے خواہاں ہیں تو اُٹھ کر اپنی غلطیوں کا جائزہ کیوں نہیں لیتے ؟

نیاز صاحب ! میں اپنی زندگی سے بیزار ہوں - لیکن قاضی عبدالغفار صاحب کی "لیلیٰ" کی طرح اس لئے نہیں کہ میں کسی ایک مرد سے متعلق ہو کر کئی بچوں کی ماں کیوں نہ بنی - بلکہ صرف اس لئے کہ آخر یہ مرد مجھے اپنی طرح کا انسان کیوں نہیں سمجھتے ؟

نیاز صاحب ! کتنے ہیں ایسے ادیب - انشا پرداز - لیڈر - اڈیٹر اور اخبار نویس جو پند و نصائح کے دفتر کے دفتر دن رات کھولتے رہتے ہیں - جو بلند سے بلند سوسائٹی کے مہذب رکن بنے پھرتے ہیں - جو لوگوں کی نظروں میں عزیز ہیں - حالانکہ اُن کے چنگل کا ہر ناخن بے گناہ لڑکیوں کے خون سے رنگین ہے - پھر آپ کہتے ہیں کہ یہ ان کا ذاتی فعل ہے - جو اُن کے لیڈرانہ فرائض سے علیحدہ ہے - اُن کی ان دونوں زندگیوں کو نہ ملاؤ -

نیاز صاحب ! لوگ کسبی کو صرف اس لئے بُرا کہتے ہیں کہ اسے چند چاندی کے ٹکڑوں اور جھوٹے آنسوؤں سے مرعوب کرکے اپنی کنیز نہیں بنا جا سکتا اور برخلاف اس کے ایک "معصوم" لڑکی جھوٹی محبت ہی کے فریب میں آکر گردن ڈال دیتی ہے -

نیاز صاحب ! میں کہنا تو نہ معلوم کیا کیا چاہتی ہوں - لیکن ڈرتی ہوں — آپ سے اور سب سے — اپنی زندگی کا ایک ورق بھیج رہی ہوں - اس کے بعد آپ مجھے مُردہ سمجھیں -

میری زندگی کا ایک ورق

مجھے اُن سے شرم آتی تھی - میں ان سے چھپی چھپی پھرتی تھی - مگر جب ان کو موقع ملتا وہ میری کتاب میں خط چھپا جاتے - آخر میری خاموشی کو دیکھ کر ایک دن ایک مختصر سا پرچہ رات کو سوتے وقت وہ میرے پاس پھینک گئے - لکھا تھا - "جب میری زندگی کی بہار مجھ سے بیزار ہے - میری تمناؤں کی دیوی مجھ سے کنارہ کش ہے - تو پھر میں کیوں زندہ رہوں - صبح آپ میری لاش دیکھیں گی" مجھے اس وقت کیا خبر تھی کہ اس قسم کے دعوے محض مکر و فریب کا نتیجہ ہوتے ہیں - میرا دل دھڑکنے لگا - میں گھبرا کر اٹھی - کمرہ میں ٹہلتی رہی - پھر چپکے ان کے کمرہ کی طرف گئی - وہ کرسی پر سر پکڑے بیٹھے تھے - میں واپس چلی آئی - کئی دفعہ گئی اور واپس آگئی - بالآخر بارہ بجے کے قریب میں دل سخت کرکے ان کے کمرہ میں داخل ہو گئی - انھوں نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا - میں نے کہا، - "کیا ارادہ ہے ؟" اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے - کھڑے ہو گئے - ایک کاغذ کھول کر کہنے لگے "سنکھیا ہے ریحانہ تم سمجھتی ہو گی ....." بہت سے ادیبانہ جملے دُہراتے رہے - میں دم بخود میز سے ٹیک لگائے کھڑی تھی - وہ اُٹھے - کواڑ بند کئے

اور میرا بازو پکڑ کر کہنے لگے۔ "میری معبودہ ....." میں بیٹھ گئی۔ میں آہستہ آہستہ ان کی ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی۔ بالآخر میں واپس آئی تو اپنی کائنات انھیں سونپ چکی تھی۔

لیکن چند دن بعد ہی مجھے دُنیا بدلتی نظر آنے لگی مجھے ان کے طرزِ عمل پر شبہ ہونے لگا تھا۔ میں نے ان سے شکایت کی۔ لیکن انھوں نے بات ٹال دی۔ لیکن جب میں نے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ تو میرا دماغ کھولنے لگا۔ میں نے اُن سے شکایت کی۔ بولے: "یہ زندگی کی رومانیت ہے۔ تم مجھ سے بدگمان کیوں ہوتی ہو" لیکن اب آندھی اُتر چکی تھی۔ بادل رفتہ رفتہ چھٹ رہے تھے۔

..... میں نے اس زندگی کو چھوڑا یا اس نے مجھے۔ یہ ایک لمبی سی گفتگو ہے۔ لیکن مجھے اس حادثہ کی خبر نہ تھی۔ اس دن "صاحب" سے سخت گفتگو ہوئی۔ دوسرے دن تھانیدار صاحب تشریف لائے۔ فرمانے لگے۔ "آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا: "میں اس وقت تک جواب دینا نہیں چاہتی جب تک آپ مجھے یہ نہ بتلا دیں کہ آپ کے اس سوال کا مدعا کیا ہے؟"

بولے: "میں پوچھتا ہوں تم کون ہو۔ کہاں سے آئی۔ تمھارے ساتھ کون ہے؟"

اُس نے سوالات کا تانتا باندھ دیا۔ اس کی آواز میں بتدریج خشونت پیدا ہو چلی تھی۔ میرے جسم کا ریشہ ریشہ کانپنے لگا۔ میں نے سمجھا۔ شاید میری موت کی ساعت قریب آگئی ہے۔ میں سکتہ کے عالم میں اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ پھر بولا:۔

"اچھا عیاشی کرنا ہے تو"..... "میں جاؤ۔ یہاں رنڈیاں نہیں رہ سکتیں۔ چوبیس گھنٹہ میں یہاں سے چلی جاؤ۔ ورنہ کوتوالی میں بیٹھی نظر آؤ گی"

میرے حواس گم ہو گئے۔ میرے لئے زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ اس طرح ڈانٹی جاؤں۔ میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا:۔ "لیکن آپ مجھے سمجھ کیا رہے ہیں؟"

بولا:۔ "جو کچھ آپ ہیں۔ سب کو معلوم ہے۔ میں نے جو کچھ کہدیا ہے اس سے آپ کے لئے مفر نہیں ہے"

اس کے بعد میں نے پہلی ٹرین سے "ب" کو تو ضرور چھوڑ دیا۔ لیکن میرے لئے غور و فکر کی ایک بالکل نئی شاہراہ کھُل گئی۔ راستہ بھر اسی اُدھیڑبُن میں لگی رہی کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں۔ سوچتی تھی کہ آج یہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ بھی علانیہ طور پر اپنی متاع کو بازار میں نہیں چنا لیکن پھر بھی میرے اوپر یہ عتاب۔ لیکن اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

میرا سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی۔ میں نے کہا کہ "دنیا کے بڑے بڑے انسان غیر شادی شدہ ہیں"۔ بولے:۔ "مگر عورت کے لئے یہ جائز نہیں"۔ میں نے کہا "کیوں؟"۔ بولے: "اسی لئے کہ وہ عورت ہے"۔ میں نے کہا: "تو عورت کا سب سے جُرم اس کا عورت ہونا؟" بولے "ہاں"۔

اس پر میں کیا کہتی۔ وہ خفا ہو کر چلے گئے۔ اور میں دیر تک سناٹے میں بیٹھی رہی۔

(نگار) آپ نے جن واقعات و حالات کو اپنے "ورق زندگی" کے نام سے پیش کیا ہے۔ اُن کے متعلق تو مجھے کچھ نہیں لکھنا سوا اس کے کہ اگر آپ کی موجودہ معاشرت و معیشت حقیقتاً نتیجہ ہے اس اولین فریب کا جو جھوٹی محبت کے جھوٹے آنسوؤں کے پردہ میں آپ کو دیا گیا تو میں کیا ساری دُنیا کو آپ سے ہمدردی ہوگی۔ درآنحالیکہ دنیا میں ایسے واقعات بھی مل سکتے ہیں کہ مرد نے جس عورت کو گلے کا ہار بنایا اسی نے ناگن بن کر اُس کو ڈس لیا۔ لیکن سوال اس وقت تو صرف یہ ہے کہ اب جبکہ اپنی موجودہ زندگی کی تلخیوں کو آپ اچھی طرح محسوس کر رہی ہیں۔ کیوں اس کے چھوڑنے پر آمادہ نہیں؟ اگر اس سے مقصود مرد سے

اختتام ہی لینا ہے تو مجبوری ہے۔ ورنہ محض سوسائٹی کے رسم و رواج کو بہانا بنانا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ جبکہ ہزاروں بار یہ رواج اس سے قبل توڑا جا چکا ہے اور آئندہ بھی برابر ٹوٹتا رہے گا، اگر واقعی کوئی عورت محبت کا رشتہ جوڑنے کے لئے تیار ہے۔ رہا آپ کا تلخ تجربہ سو دنیا میں یہ کوئی نیا تجربہ نہیں، عورتوں سے پوچھئے تو وہ سو مثالیں ایسی ہی مردوں میں سے پیش کر دیں گی، اور مرد سے دریافت کیجئے تو وہ بھی ہزاروں مثالیں عورتوں کی پیش کر دے گا۔ لیکن بانیہمہ عہد وفا کی استواری کا خیال دنیا سے مٹ نہیں سکتا۔ اور مٹے کیونکہ جبکہ آپ کا مجھ سے کٹ کر کسی دوسرے سے مل جانا اس کا امکان بھی رکھتا ہے کہ آپ پھر اس سے کٹ کر مجھ سے مل رہیں ؎

زما گسستی و با دیگراں گرو بستی بیا کہ عہد وفا نیست استوار، بیا

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنی اذیت و تکلیف کو بہت زیادہ اہم سمجھتا ہے اور کبھی اس بات کو نہیں دیکھتا کہ دنیا کا کوئی تلخ واقعہ ایسا نہیں ہے جس سے تلخ تر کوئی اور پہلے نہ گزر چکا ہو۔ قدرت کا ترکش تیروں سے بھرا ہوا ہے۔ اور اسے یہ بھی خبر نہیں کہ کون تیر کتنا سم آلود ہے۔ آنکھ بند ہے اور تیر پہ تیر چٹکیوں سے چھوڑے جا رہے ہیں۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ جس کو واقعی بہت زیادہ تڑپنا چاہئے، اس کو وہ صرف چھوتے ہوئے گزر جاتا ہے اور جو یونہی پہلے سے خراب خستہ ہے اس کا دل چھلنی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ الغرض یہ ضرور نہیں کہ آپ کا دل سچی محبت کا طلبگار ہو تو اس کو مکر و فریب سے کبھی واسطہ ہی نہ پڑے اور میں کہ یکسر مکر و فریب ہوں، مجھ کو کوئی سچی محبت کرنے والے کبھی ملے ہی نہیں۔ اس لئے اگر واقعی آپ کو کسی مرد کی بیوفائی کی طرف سے سخت صدمہ پہونچا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ مرد کی پوری جنس کو ایسا ہی نامعقول سمجھنے لگیں۔ کیونکہ اگر اس قسم کی دلیل سے کام لیا گیا تو پھر مردوں کو بھی عورت کی تمام صنف کو مکار و بے وفا سمجھنے کا حق حاصل ہوگا۔ درانحالیکہ آپ اور وہ دونوں ایسا سمجھنے میں غلطی کریں گے۔

ہر چند یہ ایک حد تک درست ہے کہ عورت کی لغزش کو ایک مرد مشکل سے معاف کرتا ہے اور خود اپنی لغزش کے متعلق وہ یہ چاہتا ہے کہ عورت اسے بھلا دے، گوارا کر لے۔ لیکن اگر آپ غور کریں گی تو معلوم ہوگا کہ مرد کا تفوق اسی کا مقتضی ہے اور مظلوم کا احتجاج ایک ظالم کے خلاف ہمیشہ بے معنی ہوا کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مرد کا یہ سلوک عورت کے ساتھ درست ہے۔ لیکن وہ درست ہو یا نادرست اس کا علاج عورت کے پاس کچھ نہیں۔ اور اسے یہ تمام مظالم برداشت کرنا پڑیں گے، جب تک وہ ہر چیز میں مرد کے برابر نہ ہو جائے۔ اور مرد سے بے نیاز ہو کر وہ دنیا میں اتنی ہی ترقی نہ کر لے جتنی مرد نے کی ہے۔ خیر۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو خواہ مخواہ آپ کی تحریر کو دیکھ کر زبان سے نکل گئیں۔ اصل مدعا تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آپ نے اپنے خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ کس حد تک مناسب ہے اور اس میں آپ نے اپنا کیا فائدہ سوچا ہے

آپ نے میرے جواب میں عتاب و سرزنش کا انداز محسوس کیا، درانحالیکہ یہ بالکل خلافِ حقیقت ہے۔ باور کیجئے کہ آپ کیا دنیا کی ہر عورت خواہ وہ کسی طبقہ و درجہ سے متعلق ہو۔ انفرادی طور پر میری برہمی کے حدود سے بہت بلند ہے اور آج تک میری زندگی میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا کہ کسی عورت کی طرف سے جذبۂ غضب و انتقام کی پرورش میں نے اپنے دل میں کی ہو۔ میں عورت سے محبت نہیں بلکہ اس کی پرستش کرتا ہوں اور اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں کہ نوعِ انسانی کی نجات صرف عورت ہی کی اصلاح پر منحصر ہے۔ اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے کہ فرطِ تاثر سے کوئی بات ایسی منہ سے نکل جائے جسے آپ زیادہ سے زیادہ "واسوخت" کہہ سکیں۔ لیکن غصہ و برہمی کا اظہار تو مجھ سے اس وقت بھی ممکن نہیں جب وہ اوروں کے نزدیک فرض کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

آپ کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے ساتھ جو ہمدردی لوگوں کو پیدا ہوئی ہے آپ اس کے قبول کرنے کے لئے طیار

نہیں - بہتر ہے آپ قبول نہ کیجئے - لیکن سوال یہ ہے کہ جو چیز آپ کو پسند نہیں وہ دُنیا کی اور تمام عورتوں کے لئے کیوں پسند فرماتی ہیں اور آپ کیوں و ساری دُنیا کی عورتوں کا درد اپنے دل میں لئے ہوئے گُڑھ رہی ہیں - جبکہ آپ کو یقین ہے کہ نہ مرد کبھی اپنی ریاکاری سے باز آنے والا ہے اور نہ عورت، باوجود اتنی تعلیم و فراست کے فریبِ محبت میں مبتلا ہونے سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہے یاد رکھئے جس وقت تک عورت میں یہ احساس باقی ہے کہ مرد کوئی ایسی چیز بھی دے سکتا ہے جو عورت کے پاس نہیں ہے اور جب تک مرد کو عورت کی اس کمزوری کا علم ہے - یہی ہنگامہ قایم رہے گا اور سچ پوچھئے تو کائنات کی رونق اسی پر قایم ہے - اگر آج دُنیا میں کوئی مرد یہ کہنے والا باقی نہ رہے کہ "میں تم پر جان دیتا ہوں" اور کسی عورت کی زبان سے یہ سننے میں نہ آئے کہ "میں تمہاری ہوں" - تو آپ ہی بتائیے کہ آپ کا جی ایسی خشک دُنیا میں لگ سکتا ہے - رہ گیا سوال مکر و فریب کا - دغا یا عدم خلوص کا، سو اس کے متعلق اب کیا کہوں سوا اس کے کہ یہ الفاظ بھی ہمارے ہی وضع کئے ہوئے ہیں - اور ہمیں نے ان کو ایک خاص مفہوم دے رکھا ہے - ورنہ فطرت کا تو یہ حال ہے کہ اگر وہ ایک قزاق کی خون آلود تلوار کو دیکھ کر قہقہہ لگاتی ہے، تو ایک بیکس و مظلوم کی آہ و زاری سن کر بھی مسکرانے سے باز نہیں رہتی - ہماری سوسائٹی ہے اور ہمیں نے کچھ قوانین اس کے وضع کر لئے ہیں - پھر اگر ہم ہی ان کو توڑ دیں تو شکایت کی کونسی بات ہے - یہ شکست و ریخت - یہ تعمیر و تخریب تو برابر اسی طرح جاری رہے گی اور قدرت کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ کرۂ ارض میں "کروبیانِ ملاءِ اعلیٰ" کو بسا کر اپنی تفریح کھو بیٹھے - اگر وہ "نحن نسبح بحمدک" سے خوش ہوتی تو باوجود اس علم اور پیشین گوئی کے کہ انسان بجز فساد اور خون بہانے کے دُنیا میں اور کچھ نہ کرے گا، کیوں اس کو دُنیا کی آبادی کے لئے منتخب کرتی - آپ کو معلوم ہوگا جب خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر بھیجنے کا مقصد ظاہر کیا تو فرشتوں نے یہی کہا تھا کہ اس کے مستحق تو ہم ہیں - جو رات دن تیری حمد و ثناء میں مشغول رہتے ہیں - نہ کہ انسان جو بجز فتنہ و فساد کے کچھ نہ کرے گا - اس اعتراض کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ "انی اعلم مالا تعلمون" یعنی تم اس کو کیا جانو - مجھے معلوم ہے کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے — معلوم نہیں مفسروں نے اس کو کیا سمجھا اور کیا بیان کیا ہے - لیکن میں اس "کیوں" کا مفہوم صرف یہی قرار دیتا ہوں کہ دُنیا کی رونق اور کائنات کی چہل پہل فتنہ و فساد ہی پر قایم ہے - معصیت و عدوان ہی سے وابستہ ہے - اور "سبوحٌ قدوسٌ" سنتے سنتے شاید خدا کو بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ "دیکھوں تو سہی مجھ سے سرتابیاں کرنے والے کیا کیا دلچسپ حرکتیں کرتے ہیں" - اور ہو سکتا ہے کہ اپنے عمّانِ عفو و کرم کے مقابلہ میں "دریائے معاصی کی تنک آبی" کا تماشہ دیکھنا منظور ہو — بہر حال اگر آپ یہ چاہیں کہ دنیا میں جتنے مرد ہیں وہ جُنید و بایزید ہو کر رہ جائیں تو ناممکن ہے، جبکہ ہر عورت رابعہ بصری ہونے کے لئے طیار نہیں - جب تک عورتوں میں کلیوپیٹرا پیدا ہو سکتی ہے - ان کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ مردوں میں نیرو اور کالیگولا کی پیدائش پر اعتراض کریں - اس لئے یہ شکوہ و شکایت بالکل بیکار بات ہے - اگر آپ عورتوں کی مظلومیت کی تلافی مردوں سے چاہتی ہیں تو اس کی ترکیب یہ نہیں ہے کہ مردوں کے ہاتھ میں تسبیح دیکر رات دن نمازیں پڑھوایا کریں - کیونکہ اس حکمت میں وہ بہت زیادہ خونخوار ہو جاتا ہے - بلکہ اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ عورتوں میں "لقمۂ تر" بننے کی صلاحیت کو کم کریں - تاکہ وہ اُن کو آسانی سے نگل نہ سکے - اور یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ یا تو آپ "اخلاق" کا مفہوم بدلکر اس کو ایسا کر دیں کہ عورت بجائے "لقمۂ تر" کے "لقمۂ خشک" بن جائے اور مرد کے لئے اس میں کوئی دلکش و دلچسپی باقی نہ رہے - یا پھر میدانِ عمل میں آکر اتنی ترقی کر لیں کہ مرد کے ہاتھ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بٹھا دیں اگر یہ زیادہ مشکل ہے تو وہی سہی -

آپ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ آیندہ آپ کسی قسم کی خط و کتابت نہ کریں گی - اور یہ بھی تقاضا ہے کہ آپ کو مُردہ سمجھ لیا جائے - سو معاف فرمائیے مجھے اس سے اتفاق نہیں - کیونکہ آپ کو مُردہ سمجھنے سے دُنیا کی زندہ دلی ختم ہو جاتی

تو بھی خیر کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن جب یہ ہونا نہیں تو پھر کیوں اس فسونِ بد کو گوارا کیا جائے۔ علاوہ اس کے میرے بعض احباب دہلی، آپ کی تحریروں میں ادب و انشاء کی خاص کیفیت محسوس کرتے ہیں اور وہ آسانی سے اپنے صوبہ کے اس فخر کو زایل ہوتے ہوئے منظور نہ کریں گے۔ رہ گیا میں، سو ہر چند اس لحاظ سے کہ "دعوتِ آب و ہوا" کی جرأت نہیں رکھتا۔ نہ مستحق خطاب ہوں نہ رائے زنی کا اہل۔ تاہم اس کا کیا علاج کہ ہنوز آنکھوں میں دم باقی ہے اور جی یہی چاہتا ہے کہ "ساغر و مینا" کو کم از کم دیکھتا ہی رہوں۔ اگر ان کو ہاتھ سے چھو نہیں سکتا ـــــ چنانچہ، آپ کی تحریر دیکھی تو بے اختیار یہ چند سطریں قلم سے نکل بھی گئیں۔ ورنہ اس عمر میں کہ انسان "حسن و عشق" کی باتوں کو بھی ریاضی و معاشیات کے اصول سے دیکھنا چاہتا ہے۔ میرے لئے ناممکن تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے بھی "قدر خود بشناس" کی حد سے گزر کر اُن حدود میں پہونچ جاؤں، جہاں کی ہر چیز باوجود آشنا ہونے کے بھی اب ناآشنا سی معلوم ہوتی ہے ـــ پھر اگر آپ کو اتنی رعایت بھی منظور نہیں تو مجبوری ہے۔ ورنہ ضرور کبھی کبھی اپنے جذبات کے رجحان سے مطلع فرماتی رہئے۔ دُنیا سے اس قدر مایوس و متنفر ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کوئی ایک ہی شخص آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کے لئے طیار ہو جائے۔ اور اسی کے ساتھ مجھ پر بھی خشونت و برہمی کا الزام قایم نہ کیجئے۔ کیونکہ باوجود ویرانیوں کے بھی دل میں ہنوز وہ کیفیت باقی ہے کہ کھلم کھلا نہیں تو سرگوشی کی حیثیت سے ضرور آپ کے کان میں اُس کے متعلق یہ کہنے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ:-

خراب ایست ولیکن درد ہوائے خوش ست

"نگار" کے پچھلے فایل

۳۲ء	=	جولائی تا دسمبر	=	ـــــــــــ	=	عـ۱۰ـ
۳۶ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ ہندی شاعری)	=	عـ۲۰ـ
۳۸ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ اصحاب کہف و خلافت نمبر)	=	عـ۲۰ـ
۳۹ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ مصحفی نمبر)	=	عـ۲۰ـ
۴۰ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ نظیر نمبر)	=	عـ۲۰ـ
۴۴ء	=	جولائی تا دسمبر	=	ـــــــــــ	=	عـ۱۰ـ
۴۶ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ انتقاد نمبر)	=	عـ۲۰ـ
۴۷ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ ماجد و لین نمبر)	=	عـ۲۰ـ
۴۹ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ افسانہ نمبر)	=	عـ۲۰ـ
۵۰ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ تنقید نمبر)	=	عـ۲۰ـ
۵۲ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ حسرت نمبر)	=	عـ۲۰ـ
۵۳ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ داغ نمبر)	=	عـ۲۰ـ

نوٹ :- صرف ایک ایک فایل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہونچے گا اُسی کو دیا جائے گا ـ قیمت محصول ڈاک کے علاوہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

غالب اور اقبال

(فرمان فتحپوری)

غالب اور اقبال دونوں اُردو کے مایۂ ناز فنکار ہیں ——— دونوں اُردو فارسی کے عظیم المرتبت شاعر، اپنے اپنے اسلوب کے موجد اور اپنی زبان کے خلاق ہیں، دونوں ابداع و اختراع کی بے پناہ قوتوں کے مالک ہیں۔ دونوں کا تبحر علمی اپنے معاصرین میں امتیازی اور طرز فکر فلسفیانہ ہے۔ دونوں نے اُردو ادب میں ترقی پسندانہ رجحانات کو رواج دیکر ہماری شاعری کو ایک نیا موڑ عطا کیا۔ اگر غالب و اقبال کی شخصیتوں کو اس خارجی مماثلت کے اسباب پر غور کریں اور دونوں کے مجموعی کلام کو پیش نظر رکھ کر اُن کی فنی، علمی اور تخلیقی بصیرتوں کا تقابلی جایزہ لیں تو ہمیں اُن کی طبیعتوں میں عجیب تطابق اور تشابہ نظر آتا ہے، بات یہ ہے کہ اقبال شروع میں زبان کی سادگی اور بیان کے لوچ کی وجہ سے داغ کی طرف متوجہ ہوئے اور ابتدائی غزلیں اُنھیں کے رنگ میں کہیں لیکن چونکہ اقبال اور داغ میں کوئی ذہنی مناسبت نہ تھی اس لئے وہ بہت جلد داغ کے رنگ سے ہٹ کر غالب کی طرف مایل ہوئے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری مصنف "جدید اُردو شاعری" لکھتے ہیں کہ :-

"داغ کی صناعی سے سیر ہو جانے کے بعد فطرتاً اقبال کی طبیعت کو غالب سے لگاؤ پیدا ہوا، غالب کے خیال میں وہی عمق ہے جس کی اقبال کو ابتدا سے تلاش تھی، چنانچہ اُنھوں نے ارشد وغیرہ کی صحبتوں سے استفادہ کیا۔ داغ سے اصلاح لی۔ اور غالب سے معنوی فیض حاصل کیا اور یہ آخری اثر اُن کی طبیعت کے مناسب تھا اس لئے دیر پا ثابت ہوا اور آخر تک کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتا رہا"۔

اس میں شبہ نہیں کہ اقبال اگر کسی اُردو شاعر سے متاثر ہوئے ہیں تو وہ صرف غالب تھے۔ بانگ درا میں غالب پر جو نظم ہے اس میں کلام غالب کے ان نکات اور محاسن کی تفصیل بھی ملتی ہے جنھوں نے اقبال کو غالب کا گرویدہ بنا لیا تھا اور یہ گرویدگی آخر تک قائم رہی۔ "جاوید نامہ" میں "ارواح جلیلہ" کے عنوان سے روح غالب اور اقبال کا جو مکالمہ ملتا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال آخر تک اپنے ذہنی مسایل کے حل میں روح غالب کے فیض سے استفادہ کرتے رہے۔ اس، بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم "اقبال کے یہاں رومی بھی ہیں نطشے بھی، کانٹ بھی اور برگساں بھی، کارل مارکس بھی ہیں اور لینن بھی، بیدل بھی ہیں اور غالب بھی لیکن اقبال کے اندر ان سب میں کسی کی حیثیت جوں کی توں باقی نہیں رہی۔ اس نے اپنے تصورات کا قالین بنتے ہوئے کچھ رنگ دھاگے اور بعض خاکے اُن لوگوں سے لئے ہیں لیکن اُس کے مکمل قالین کا نقشہ کسی دوسرے نقشہ کی ہو بہو نقل نہیں ہے"۔

اقبال کے قالین کے اُن دھاگوں اور خاکوں کے متعلق جو بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم دوسروں سے لئے گئے ہیں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اُن دھاگوں اور خاکوں کو تفصیل سے سامنے لانے کی کوشش نہیں کی گئی جو اُنھوں نے اُردو کے ایک شاعر سے لئے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے "روح اقبال" کے حاشیہ میں غالب اور اقبال کے ذوق باطنی کی مناسبت کی طرف کہیں کہیں اشارے کئے ہیں۔ "آثار غالب" کے مصنف نے بھی اُردو شاعری سے قطع نظر کرکے غالب و اقبال کے صرف فارسی کلام کا مختصر تقابلی جایزہ لیا ہے لیکن ان دونوں کے مجموعی کلام کو پیش نظر کرکے اب تک اس مسئلہ پر تفصیلی قلم نہیں اُٹھایا گیا۔ چنانچہ ہمیں اس جگہ غالب و اقبال کے ذہنی و فنی اشتراک کا ذرا وضاحت سے جایزہ لینا ہے۔

اقبال قدیم مشرقی فنکاروں کی طرح آرٹ کے سلسلہ میں ایمائیت و رمزیت کو محض واقعہ نگاری پر ترجیح دیتے ہیں اور یوں اظہار خیال کرتے ہیں ؎

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است ۔۔۔ حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا ۔۔۔ حسن تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

فنی معاملہ میں غالب بھی اعلیٰ نقطۂ گناہ کو محبوب و ملحوظ رکھتے ہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۔۔۔ بنتی نہیں بادہ و ساغر کہے بغیر

فارسی میں کہتے ہیں ؎

رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد ۔۔۔ محرم آں است کہ رہ جز بہ اشارت نہ رود

دونوں کے فارسی اشعار تقریباً متحد المعنی و متحد اللفظ ہیں۔ اقبال ہر چند فلسفی شاعر ہیں لیکن وہ اس دعویٰ کے لئے کہ "برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است" کوئی دلیل پیش نہیں کرتے۔ اس کے برعکس غالب یہ کہہ کر کہ "رمز شناسی کا" "ہر نکتہ ادائے دارد" اپنے بیان کو استدلال سے مضبوط کر دیتے ہیں۔ اقبال کے اردو کا پہلا مصرعہ "فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا" واضح نہیں ہے شعر کی حقیقت کو ایسے حسن تمنا سے تعبیر کرنا جسے روبرو نہ کہہ سکیں، لطیف بات ہے اور سمجھ میں آتی بھی ہے لیکن 'فلسفہ' کے لئے یہ بات عجیب سی ہے کیونکہ فلسفہ کا تو آغاز ہی چھان بین، کرید اور استفسار در استفسار سے ہوتا ہے۔

اقبال کا خیال ہے کہ بعض محسوسات و جذبات ایسے لطیف ہوتے ہیں الفاظ کا بار بھی نہیں اٹھا سکتے یا یوں کہہ لیجئے کہ الفاظ احساسات کو ان کی لطافت و نزاکت سمیت پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں احساس سے لطف اندوز ہونے کے لئے صرف علمی سرمایہ داری یا ذہنی پختگی سے کام نہیں چلتا بلکہ وجدان یا باطنی شعور کا سہارا لینا پڑتا ہے اور ذہن کے بجائے دل کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہر معنیٔ پیچیدہ در حرف نمی گنجد ۔۔۔ یک لحظہ بہ دل در شو شاید کہ تو دریابی

غالب نے بھی فارسی میں اس خیال کو یوں نظم کیا ہے ؎

سخن ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر ۔۔۔ نشود گرد نمایاں ز رخ توسن ما

یہاں بھی غالب نے "سخن ما نہ پذیرد تحریر" اور "نشود گرد نمایاں ز رخ توسن ما" کی وجہ "لطافت" کو قرار دیکر شعر کو فنی اور منطقی دونوں اعتبار سے مدلل و لطیف بنا دیا ہے۔

اقبال، آرٹ میں اثر آفرینی کے لئے فنکار کے خلوص اور احساس کی صداقت کو ضروری جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک خلوص کے بغیر الفاظ کی طلسم سازی نہ کوئی لازوال آرٹ پیدا کر سکتی ہے اور نہ کوئی آرٹ اس وقت تک اپنے اظہار میں کامیاب ہو سکتا ہے تاوقتیکہ اس میں فنکار کے خونِ جگر کا رچاؤ نہ ہو۔ اقبال کہتے ہیں:-

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر ۔۔۔ نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت ۔۔۔ معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

غالب نے اس خیال کو یوں نظم کیا ہے ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسد ۔۔۔ پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

اقبال خود کو آتش نوا کہتے ہیں اور اپنے سوزِ دروں، کو ایسی آتش مشتعل سے تعبیر کرتے ہیں جس سے اشعار کی شکل میں شرارے چھوٹتے ہیں۔ کہتے ہیں:-

بڑا کریم ہے اقبال بے نوا لیکن ۔۔۔ عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

غالب کے "جوہر اندیشہ" کی گرمی بھی اقبال سے کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ ان کی "آہ آتشیں" سے کبھی 'بالِ عنقا' جل جاتا ہے اور

کبھی "تندیِ صہبا" سے "آبگینہ" پگھل جاتا ہے ؎

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
وہ تپ عشق تمنا ہے کہ پھر صورت سمع — شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

اقبال غزل گوئی کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس طرح اُن کے سوزِ دل کے نکاس کی صورت ہاتھ آتی ہے جو ایک قسم کا سکون بخشتی ہے۔ لکھتے ہیں ؎

غزلے روم کہ شاید بنوا قرار آید — تپِ شعلہ کم نہ گردد ز گسستنِ شرارہ

غالب بھی ہوسِ غزل سرائی اور تپشِ فسانہ خوانی کی وجہ یہی بتاتے ہیں کہ اس طرح اُنھیں عرض حال کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال - بخشی — ہوسِ غزل سرائی تپشِ فسانہ خوانی
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب — کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

جہاں تک فن میں مقصدیت کا سوال ہے، اقبال ایک مکمل فلسفۂ حیات رکھتے ہیں اور اسی فلسفہ کی تبلیغ و اشاعت ان کا اصل مقصود تھا۔ اقبال نے اپنے آپ کو شاعر کہلوانا نہ کبھی پسند کیا اور نہ اُنھیں یہ بات کبھی اچھی معلوم ہوئی کہ کوئی اُنھیں محض شاعر سمجھے۔ لکھتے ہیں ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ
نہ شیخ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبال — فقیر راہ نشین است و دل غنی دارد

'زبور عجم' میں لکھتے ہیں ؎

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست — سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

'اسرار خودی' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ؎

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست — بت پرستی بت گری مقصود نیست
آنچہ گفتم از جہانے دیگر است، — ایں کتاب از آسمانے دیگر است
بکوئے دلبراں کارے نہ دارم، — دلِ زارے غمِ یارے نہ دارم

غالب کے پاس کوئی متعین مقصدِ حیات نہ تھا وہ فلسفی سے زیادہ شاعر ہی رہنے پر فخر کرتے تھے ؎

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعر نغز گوئے خوش گفتار

وہ زندگی کے اہم پہلوؤں کو جس طرح محسوس کرتے ہیں۔ انسانی نفسیات کا لحاظ رکھکر اُنھیں اسی طرح بیان کر جاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک زندگی کا خط مستقیم نہیں بلکہ منحنی ہے۔ اس لئے راہِ حیات کی طرح اُن کے خیالات میں بھی ناہمواری ملتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ غالب کے کلام میں سرے سے کوئی مقصدیت نہیں ہے، غلطی ہے بلکہ جس طرح اقبال نے کہا ہے کہ ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن، — جو آنکھ حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
جستجو کل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے — درد بے پایاں ہے در لا دوا رکھتا ہوں میں

اسی طرح غالب بھی شاعری میں حقیقت شناسی کے قایل ہیں۔ شاعری میں محض امیر حمزہ کی داستان اُنھیں کبھی نہیں بھائی اور جو فنکار الفاظ میں فطرت کے راز سربستہ نہ کھول سکے اور جزو میں کل یا قطرہ میں دجلہ کا مشاہدہ نہ کر سکے تو اُن کے نزدیک وہ دیدۂ بینا نہیں بلکہ لڑکوں کا کھیل ہے ؎

ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونِ ناب — قصۂ حمزہ کا ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل — کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

شاعری میں مقصدیت کے متعلق غالب ایک فارسی خط میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں : -

"ذوق سخن کہ ازلی آوردہ ام - مرا بداں فریفتہ کہ آئینہ زود دن وصورتِ معنی نمودن نیز کار نمایان است"۔

غرض غالب واقبال دونوں کے پیشِ نظر ایک مقصدیت تھی اور اُن میں کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ اقبال کی مقصدیت متعین، منضبط اور حکیمانہ ہے اور غالب کی مقصدیت منتشر، رندانہ اور شاعرانہ - اقبال اپنی بات اکثر ذہن کے ذریعہ سے دل میں اُتارتے ہیں اور غالب دل کے ذریعہ سے ذہن میں -

فن وادب کی طرح زندگی کے دوسرے مسایل میں بھی اکثر جگہ ذہنی یگانگت ملتی ہے - اقبال، قدیم صوفی مفکروں کی طرح کائنات کو شاہد معنی کا آئینہ بتاتے ہیں اور تخلیق کائنات کی غایت اُن کے نزدیک یہ ہے کہ شاہد معنی اس آئینہ میں اپنے حسن کا آپ تماشہ دیکھے۔ زبورعجم میں لکھتے ہیں :-

صورت گرے کہ پیکرِ روز و شب آفرید — از نقش این و آں بتماشائے خود رسید

غالب نے بھی فارسی کے ایک شعر میں یہی بات کہی ہے لیکن ان کا اندازِ بیان اقبال سے کہیں زیادہ موثر ولطیف ہے - کہتے ہیں ؎

جلوۂ وانظارہ پنداری کہ از یک گوہر است — خویش را در پردۂ حلقے تماشہ کردۂ

"در پردۂ حلقے تماشہ کردۂ" کے ٹکڑے نے شعر میں جو کیف و اثر بھر دیا ہے وہ اقبال کے شعر میں مفقود ہے۔ غالب نے اُردو میں اس خیال کو یوں پیش کیا ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں، — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اقبال کا خیال ہے کہ انسان کی طرح کائنات اور اس کے تمام مظاہر روزِ ازل سے ارتقا پذیر ہیں اور اپنے اس دعوے کے لئے وہ نیرنگیِ عالم کی مدد لیتے ہیں ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید، — کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

غالب کے یہاں بھی کائنات کے متعلق یہی تصور ملتا ہے - ان کا تصور اقبال کی طرح فلسفہ تو نہیں لیکن وہ کائنات کی ارتقا کے ضرور قائل ہیں - اپنے دعویٰ کے ثبوت میں وہ اسی استدلال سے کام لیتے ہیں جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے - ہاں اُن کا انداز بیان خالص غزل کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے ؎

آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرایش — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

اور جس طرح اقبال خودی کی تکمیل کے لئے سرگرداں ہیں اور خالق کائنات سے بصد شوخی کہہ دیتے ہیں کہ ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں — کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

بالکل اسی طرح غالب حاکمِ قضا وقدر سے کہہ دیتے ہیں کہ ؎

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اب تک — رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہیں

اقبال کی شاعری کا سب سے کارآمد پہلو اس کی رجائیت ہے - اُن کے نزدیک زندگی کی غایت ہی رجائی ہے - غم تو رجائیت کا ایک تتمہ ہے جس کے بغیر رجائیت کا مفہوم ہی واضح نہیں ہوتا - اس رجائیت کا راز وہ اضداد کی باہمی کشمکش میں پوشیدہ بتاتے ہیں اور ہر تازہ دشواری کو کامیابی کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں - چنانچہ وہ خطرات ومشکلات کو حیات کی بقا وارتقا کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں - کہتے ہیں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز، — چراغِ مصطفوی سے شرار بولہبی

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی — ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی،

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

اقبال کی طرح غالب نے کوئی رجائی فلسفہ تو نہیں پیش کیا پھر بھی اُنھیں قنوطی شاعر کہنا غلطی ہے۔ ہر چند کہ اُن کے یہاں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو انھیں قنوطی ثابت کرنے کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن اگر اُن کی مجموعی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ کریں اور انسان کی عمل کی کسوٹی پر اس کے تاثرات کو پرکھیں تو پھر اُنھیں رجائی شاعر کہنے کے علاوہ چارہ نہیں ہے۔ اقبال کی طرح غالب بھی فطرت کی تضاد پسندی کو فروغ حیات کے لئے ضروری جانتے ہیں وہ اس بات کو محض واعظانہ یا ناصحانہ انداز میں پیش نہیں کرتے بلکہ بڑے وثوق و دلیل کے ساتھ تضاد پسندیوں کی برکتوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

کشاکشہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی — ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب — لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

دونوں کی رجائیت میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ غالب زندگی کے صرف عملی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں اور اقبال نظری بحث کو اصل حیات پر حاوی کر دیتے ہیں چنانچہ وہ غم کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں اور مجرد رجائیت کی تلقین فرماتے ہیں۔ غالب زندگی و غم میں چولی دامن کا ساتھ بتاتے ہیں اور موت سے پہلے غم سے نجات پانا مشکل سمجھتے ہیں اُن کے خیال میں غم سے یکسر نجات پانے کی کوشش یا ہر رنج پر مسکراتے رہنے کی تلقین غیر نفسیاتی اور غیر فطری ہے۔ دانستہ رنج و غم کا اظہار نہ کرنا اور ہر حالت میں گیت گاتے رہنا نظری طور پر ممکن سہی عملی طور پر ممکن سہی عملی طور پر ممکن نہیں۔ چنانچہ غالب اپنے اس دعویٰ کے لئے نفسیاتی دلیل پیش کرتے ہیں ؎

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالۂ و ساغر نہیں ہوں میں

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتا ہے دھواں — ہر کوئی درماندگی میں آہ سے مجبور ہے

غالب کے ان خیالات سے یہ نتیجہ نکالنا کہ غالب یاس و قنوط کی تلقین کرتے ہیں کسی طرح درست نہیں۔ ہر چند کہ وہ غم کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ غم کی تاب نہیں لاتے۔ اقبال کی طرح وہ بھی زندگی کے ہر رنج کو خوشی اور حیات کی ہر تلخی حلاوت میں، ہر اضطراب کو سکون میں تبدیل کر دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ صرف یہ کہ وہ انسانی نفسیات کے حدود سے آگے بڑھ کر فوق البشر بننے کی کوشش نہیں کرتے ذیل کے چند اشعار اُن کی رجائیت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا ؎

قفس میں مجھ سے روادادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا،

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

فارسی میں کہتے ہیں ؎

شود روانیِ طبعم فزون ز سختیِ دہر — بسنگ تیز تواں کرد تیغِ بران را

می ستیزم با قضا از دیر باز، — خویش را بر تیغِ عریاں می زنم

لعب! شمشیر و خنجر می کنم — بوسہ بر سا طور و پیکاں می زنم

اقبال خودی کو جسے وہ 'احساسِ نفس' یا 'یقینِ ذات' سے تعبیر کرتے ہیں زندگی کا سرچشمہ بتاتے ہیں۔ اقبال کا خیال ہے کہ خودی

جس قدر محکم و توانا ہوتی ہے شخصیت بھی اسی قدر قوی و مستحکم ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک کائنات کے تمام نامی و غیر نامی مظاہر خودی کے رہینِ منت ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی — وہ صدف کیا ہے قطرے کو گہر کر نہ سکے

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے — نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

'اسرارِ خودی' میں لکھتے ہیں ؎

پیکرِ ہستی ز اسرارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالمِ پندار کرد

غالب کے یہاں اقبال کی سی فلسفیانہ خودی تو نہیں مگر ہاں احساسِ نفس یا ادراکِ ذات کو جسے اقبال خودی کہتے ہیں غالب بھی عزیز رکھتے ہیں اور اُن کے اثرات اُن کی عملی زندگی میں بھی پوری طور سے نمایاں ہیں۔ حالی کا بیان ہے کہ: "مرزا خودداری اور حفظ وضع کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ امراء و عمائد سے برابری کی ملاقات رکھتے تھے۔ جو کوئی اُن کے مکان پر نہ آتا وہ بھی اس کے یہاں نہ جاتے اور وقار و عزت کو سب پر مقدم جانتے"۔ محمد حسین آزاد جنھوں نے غالب کو ذوق سے کم تر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لکھتے ہیں کہ:۔

"جب دہلی کالج نئے اصول پر قایم کیا گیا اور فارسی لکچرار کے لئے مرزا اور امام بخش صہبائی کا نام لیا گیا تو مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ ہند نے سب سے پہلے مرزا کو بلایا۔ مرزا پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ دستور کے مطابق سکریٹری صاحب اُن کو لینے آئیں گے جب بہت دیر ہو گئی اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے تو وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا: "جب آپ دربارِ گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا لیکن اس وقت تو آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اس موقع پر وہ نہ تو نہیں ہو سکتا"۔ مرزا نے کہا: "گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لئے کیا ہے کہ اعزاز زیادہ ہو نہ اس لئے کہ موجودہ اعزاز میں فرق آئے"۔ صاحب نے کہا:۔ "ہم قاعدہ سے مجبور ہیں"۔ مرزا نے کہا:۔ "مجھے اس خدمت سے معذور رکھا جائے" اور کہکر چلے آئے"۔

چنانچہ ذیل کے اشعار میں خودی کی وہی روح کام کر رہی ہے جو اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اقبال کا بیان حکیمانہ ہے اور غالب کا شاعرانہ ؎

درمنت کش دوا نہ ہوا، — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائے

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اب رہا شاعر کے قول و فعل میں قطعی مطابقت کا سوال سو شاعرِ عالم باعمل کبھی نہیں ہوتا اور اس میں غالب و اقبال دونوں برابر ہیں۔ ذیل کے فارسی شعر سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کو گفتار و کردار کی مطابقت کا احساس تھا اور وہ قول کو فعل سے ہم آہنگ کر کے فن میں رونما کرنا چاہتے تھے ؎

باخرد گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گو — گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود (غالب)

لیکن تاریخ ادب شاہد ہے کہ غالب کے یہاں گفتار و کردار کا یہ پیوند بہت کم برقرار رہا ہے ہر چند کہ اُن کے بیشتر کلام میں اُن کی عملی زندگی کی عکاسی ہے پھر بھی اُن کے کلام و زندگی میں مطابقت بہت کم ہے، اسی طرح جب ڈاکٹر قاضی عبدالحمید نے اقبال سے سوال کیا۔

"آپ کے اشعار نے تو ہندوستان میں آزادی کی روح پھونک دی ہے لیکن اب اس سلسلہ میں کچھ عملی جدوجہد نہیں فرماتے۔ تو انھوں نے جواب دیا: "شعر کا تعلق عالم علوی سے ہے، چنانچہ جب شعر کہتا ہوں عالم علوی میں ہوتا ہوں۔ لیکن یوں میرا تعلق عالم اسفل سے ہے" ظاہر ہے اقبال کا یہ جواب حکیمانہ نہیں بلکہ شاعرانہ ہے اور وہ گفتار و کردار کے عدم مطابقت کا اعتراف خود اس طور پر کر گئے ہیں ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے — گفتار کا غازی یہ تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

ہر چند کہ اقبال نے 'جاوید نامہ' تک پہونچنے میں اپنے پیغام میں خالص اسلامی نظریات کو کثرت سے داخل کر کے اپنے پیغام کو مخصوص کر لیا اور اُن کے مخاطب بڑی حد تک صرف مسلمان رہ گئے پھر بھی اقبال کا اسلام کسی مولوی یا مُلّا کا اسلام نہیں جس میں انسانیت کے سانس لینے کی گنجایش نہیں بلکہ وہ تو اخوتِ عام کا سبق دیتے ہیں اور بنی نوع انسان کو صرف یقین۔ عمل اور محبت کے رشتوں سے باہم مربوط کرنا چاہتے ہیں اُن کے یہاں محض عقاید کی بنیادوں پر جنّت و دوزخ کی تقسیم نہیں ہوتی۔ وہ ایک آفاقی تصور حیات رکھتے ہیں اور اپنے مسلک کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

دُرویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

پرسوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار — آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

اس کے بعد وہ بتان رنگ و خون کو توڑ کر نوع انسانی کو ایک ملت میں گم ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں اور صرف اعمال کی بنیادوں پر شخصیتوں کے مراتب متعین کرتے ہیں ؎

بتان رنگ و خون کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا — نہ افغانی رہے باقی نہ ایرانی نہ تورانی

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے — پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے — جو ہے راہِ عمل میں گامزن۔ محبوب فطرت ہے

کیوں گرفتار طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو — دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

یقین محکم عمل پیہم محبّت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

ذیل کے فارسی اشعار میں اقبال کا عالمگیر تصور حیات اور بھی واضح ہو گیا ہے ؎

من نہ گویم از بتاں بیزار شو — کافری شایستہ از زنار شو

گر ز جمیعت حیاتِ ملت است — کفر ہم سرمایۂ جمیعت است

ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور — تو ز آذر من ز ابراہیم دور

غالب بھی اسی عالمگیر اخوت کے حامی ہیں اور وہ اپنے اس نصب العین کو کہیں بھی رنگ و نسل و مذہب و وطن کی تنگ نظری سے ملوث نہیں کرتے۔ وہ صرف انسانی اخلاق و روحانی اقدار کی مدد سے بنی نوع انسان کو ایک مرکز پر مجتمع کرنا چاہتے ہیں اور صرف اعمال کی کسوٹی پر انسانی کردار کو پرکھ کر اُن کے مراتب کا یقین کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے — مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اقبال کی طرح غالب نے بھی اپنے نقطۂ نگاہ کو فارسی میں اور وضاحت سے پیش کیا ہے ؎

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایماں زیستن — حیف کافر مردن و آلودخ مسلماں زیستن

جز سخن کفر و بے ایمانے کجاست — خود سخن در کفر و ایماں می رود ،

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست — ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

اور جس طرح اقبال نے اپنے متعلق لکھا ہے کہ ؎

اقبال غزلخواں را کافر نتواں گفتن — سودا بہ دماغش زد از مدرسہ بیروں بہ

بالکل اُسی طرح غالب نے اپنے متعلق لکھا تھا لیکن اس کا انداز اقبال سے زیادہ شگفتہ و اثر آفریں ہے ؎

کارے عجب افتاد بایں شیفتہ مارا ، — مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت

اقبال کا خیال ہے کہ کائنات کی تمام ہنگامہ خیزیاں صرف عشق کے دم قدم سے ہیں ورنہ اس بزم خموشاں میں کوئی چہل پہل نہ تھی۔ فرماتے ہیں ؎

عشق از فریادِ ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد — ورنہ ایں بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

غالب بالکل اسی خیال کو اُردو کے ایک شعر میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

رونقِ ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے — انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

"عشق خانہ - ویران ساز" کی ترکیب غالب کی قوت اختراع پر دال ہے۔ ہر چند کہ عشق کا نتیجہ اضطراب و بے قراری ہے لیکن اقبال عشق کی اس ستم ظریفی کو کیا کیا جائے کہ بایں ہمہ بیتابی، دل کو محبت میں ایک آسودگی نصیب ہوتی ہے ؎

ایں حرف نشاط آور می گویم و می رقصم — از عشق دل آسائد بایں ہمہ بیتابی،

غالب اُردو میں اس خیال کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی درد لا دوا پائی ،

اقبال عشق میں ایسے وصال کے قایل نہیں جو اُن کے وجود کو نفی کر دے۔ اُن کے خیال میں قطرہ دریا کے وصال سے فنا نہیں ہوتا بلکہ اس کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ فرد جماعت میں شریک ہو کر اپنی انفرادی توانائی کو نہیں کھوتا بلکہ اس میں اجتماعی توانائی کے آثار رونما ہونے لگتے ہیں - چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

فرد قایم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

فرد ما اندر جماعت گم شود ، — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

غالب کے یہاں بھی وصال کا یہ تصور موجود ہے ؎

قطرہ دریا سے جو مل جائے تو دریا ہو جائے — کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے

آبرو کیا خاک اس گل کی - جو گلشن میں نہیں — ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

اقبال کا خیال ہے کہ انسان روزِ ازل سے حقایق و معارف کی تلاش میں سرگرداں و حیراں ہے۔ وہ خود اس کی ذات میں پوشیدہ ہیں اور صرف اپنی ذات کی آگاہی سے کائنات کے راز سربستہ کھولے جا سکتے ہیں۔ کائنات کی حقیقت سے صرف وہ بہرہ مند ہوتا ہے جو اپنی حقیقت سے آگاہ ہو اس لئے اقبال معرفت ذات پر بہت زور دیتے ہیں اور اعتماد و اجتہاد ذاتی کی تلقین کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

تا بہ کے طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم — اپنے شعلہ سے عیاں آتش سینائی کر

ایں گنبدِ مینائی ایں پستی و بالائی ، — درشد بہ دل عاشق شاید کہ تو دریابی

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است — ذات را بے پردہ کردن زندگی است

حسن را از خود بروں جستن خطا است — ہر چہ می خواہی ز پیش ما مجا است

غالب بھی ادراکِ ذات کو اجتماعی عرفان کے مترادف سمجھتے ہیں - کہتے ہیں ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ـــــ ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر ـــــ ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
یعنی بحسب گردش پیمانہ صفات ـــــ عارف ہمیشہ مست مئے ذات جائیے

غرض غالب و اقبال دونوں عرفان ذات کی برکات و اثرات سے بہرہ ور ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اقبال معرفت کی قوت تسخیر کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

ایں جہاں چیست صنم خانۂ پندار من است ـــــ جلوۂ او گرِ و دیدۂ بیدار من است
ہستی و نیستی از دیدنِ و نادیدنِ ما ـــــ چہ زمان و چہ مکاں شوخیِ افکار من است

اور غالب صرف یہ کہکر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ـــــ ہم کو منظور تنک ظرفیِ منصور نہیں

اقبال کہتے ہیں کہ فطرت کی گلکاریاں انسان کی شوخیِ افکار کے بغیر بے روح و بے جان ہیں۔ لالہ کا دل ہزار داغدار سہی لیکن وہ انسان کے دل کی طرح آرزو کا گھائل نہیں۔ نرگس میں لاکھ بصارت سہی لیکن اس میں وہ بصیرت کہاں جو لذتِ دیدار یار سے سرفراز ہوتی ہے چنانچہ زبور عجم میں کہتے ہیں ؎

لالۂ ایں گلستاں داغِ تمنائے نہ داشت ـــــ نرگس طنازِ او چشمِ تماشائے نداشت

غالب بھی فطرت کے ہر نقش کو گوشت پوست کے انسان کے مقابلہ میں ہیچ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان میں جمیع حسن لطافت مرکوز ہیں، گل و نرگس کی رونق و زینت صرف انسانی توجہ کی پابند ہے ؎

گلت را نوا، نرگست را تماشا، ـــــ تو داری بہارے کہ عالم نہ دارد

اقبال کے نزدیک انسانی زندگی کی بقا اُس کے شہید جستجو رہنے تک ہے۔ آرزو کی موت گویا انسان کی موت ہے۔ چنانچہ وہ انسان کو مستقل آرزو مند رہنے کی تلقین کرتے ہیں، جیسے ہی اُن کی ایک آرزو پوری ہوتی ہے دوسری آرزو سامنے آجاتی ہے۔ اگر اُنھیں چنگاری ہاتھ آجاتی ہے تو وہ ستارہ کی جستجو کرتے ہیں اور اگر ستارہ مل جاتا ہے تو آفتاب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور آرزوؤں کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

ایں نگارے کہ مرا پیش نظر می آید ـــــ خوش نگار است ولے خوشتر ازاں می بایست
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے ـــــ سرِ منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے
چوں نظر قرار گیرد پئے خوشتر نگارے ـــــ تپد آں زماں دلِ من بہ نگار خوبروئے
ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی ـــــ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے
فطرتِ شاعر سراپا جستجو ست ـــــ خالق و پروردگار آرزو دست

اقبال کے درد و سوز و آرزو مندی کے آثار غالب کے یہاں اس طرح نمایاں ہیں ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ـــــ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب انسانی فطرت کا یہ ایک خاصہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنی بقا کے لئے نت نئی آرزوئیں پیدا کرتا رہتا ہے اور یہ سلسلۂ شوق کسی مرحلہ میں اُن کے یہاں کم نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں ؎

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت۔ کیا کروں ـــــ آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے
نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے شوق کم میرا ـــــ حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

یہ شوق دائمی اور تجسس مسلسل ہر چند کہ صبر آزما ہوتا ہے لیکن غالب کے نزدیک فطرت انسانی اس اضطراب سے اس قدر مانوس ہوتی ہے کہ اسے اسی بےچینی میں چین نصیب ہوتا ہے ؎

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

رنج رہ کیوں کھینچئے واماندگی کو عشق ہے اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

شوق ہے ساماں طراز نازش ارباب عجز ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

اقبال انسانی قوت تسخیر کو لامحدود تصور کرتے ہیں اور وہ صرف اس عالم رنگ و بو پر قانع نہیں بلکہ انسانی تصرفات کے امکانات کی طرف اُردو کی ایک مسلسل غزل میں یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں، یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

غالب بھی اپنے ماحضر سے مطمئن نہیں اور اپنی دنیائے تمنا کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں۔ کہتے ہیں ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

ایک دوسرے شعر میں اپنی اس آرزو کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے پرے ہوتا کاشکے مکاں اپنا

اقبال چونکہ شوق مسلسل اور اضطراب دائمی ہی کو بقائے حیات کا ضامن جانتے ہیں اس لئے وہ ایسے پرسکون مقام سے گریزاں نظر آتے ہیں جہاں کی فضا اُن کی سیماب پائی اور تلخ کوش طبیعت کے منافی ہو۔ چنانچہ ہمارے یہاں جنت میں جس دائم و جامد سکون کا پتہ ملتا ہے وہ اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ "پیام مشرق" میں 'حور و شاعر' کے عنوان سے جو ان کی نظم ہے اس میں اس کے تصور بہشت کی تفصیل ملتی ہے اور اس نظم کے آخری شعر سے جنت سے اُن کی طبیعت کی بیزاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

دلِ عاشقاں بمیرد ز بہشت جاودانے نہ نوائے دردمنداں نہ غمے نہ غمگسارے

بہشت کے متعلق اقبال دوسری جگہ یوں اظہار خیال کرتے ہیں ؎

کجا ایں روزگارے شیشہ بازے بہشت ایں گنبدِ گرداں ندارد

ندیدہ دردِ زنداں یوسفِ او زلیخا یش دل نالاں ندارد

خلیل او حریف آتشے نیست کلیمش یک شرر درجاں ندارد

ز صرصر در نیفتد زورق او خطر از لطمۂ طوفاں ندارد

یقیں را در کمیں لوک و مکانیست وصال اندیشۂ ہجراں ندارد

کجا آں لذت عقل غلط سیر اگر منزل رہ پیچاں ندارد

مزی اندر جہانِ کور ذوقے کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

غالب نے اپنی مثنوی "ابر گہربار" میں بہشت کے متعلق بالکل انھیں خیالات کا اظہار یوں کیا ہے ؎

دراں پاک میخانۂ بے خروش چہ گنجایش شورشِ ناو و نوش

سیہ مستیِ ابرِ باراں کجا خزاں چوں نباشد بہاراں کجا

اگر حور در دل خیالش کہ چہ غمِ ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ

چہ منت نہد ناشناسا نگار — چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزم دمِ بوسہ اینش کجا، — فریبد بسوگند دینش کجا
برد حکم و بنود لبش تلخ گو — دہد کام و نبود دلش کام جو
نظر بازی و ذوق دیدار کو — بفردوس رو زن بدیوار کو

ہر چند کہ اقبال کے اشعار کا اسلوب ان کا اپنا ہے پھر بھی اگر غالب و اقبال کے فارسی اشعار کو ایک ساتھ پڑھیں اور ان کی تشبیہ و استعارات و استدلال کو نظر میں رکھیں تو اس مقام پر دونوں کے خیالات ایک دوسرے پر اس طرح منطبق ہوتے ہیں جیسے اقبال نے غالب کی مثنوی کو سامنے رکھ کر اشعار کہے ہوں۔ فرق یہ ہے کہ اقبال کے اشعار اُن کے تمام کلام کی طرح اسلامی تلمیحات و استعارات سے آراستہ ہیں اور غالب کا بیان خالص رندانہ اور شاعرانہ ہے۔ "آثارِ غالب" کے مصنف نے بھی ان اشعار کا مقابلہ کیا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے غالب کے اندازِ بیان کو متبذل بتایا ہے۔ ہمارے خیال میں غالب کے اشعار میں ابتذال کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے اشعار میں اقبال کے مقابلہ میں غزل کا رنگ اور نکھر آیا ہے۔ غالب نے اسی خیال کو بڑے خوبصورت اجمال کے ساتھ فارسی کی غزل کے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے ؎

جنّت چہ کند چارۂ افسردگیِ ما — تعمیر باندازۂ ویرانیِ ما نیست

بہشت کی آرائش و تعمیر کے لئے یہ کہنا کہ "تعمیر باندازۂ ویرانیِ ما نیست" غالب کے علاوہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس مصرعہ نے خیال کو غزل کی کلاسک سے جس طرح مربوط کر دیا ہے اس سے اہلِ ذوق ہی حظ اُٹھا سکتے ہیں۔ فارسی کے علاوہ اُردو کے متعدد شعرا میں بھی غالب کے یہاں وہی تصورِ بہشت ملتا ہے جو اقبال نے اپنے قطعہ 'یا عرد شاعر' والی نظم میں پیش کیا ہے۔ غالب کہتے ہیں ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن، — دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

ان اشعار کے علاوہ غالب نے مرزا حاتم علی بیگ مہر کو خط لکھا ہے۔ اس میں تصور کو ایسے لطیف و حسین طرح پر بیان کیا ہے کہ نثر کے اس ٹکڑے پر اس موضوع کی بہت سی نظمیں اور اشعار بے رنگ معلوم ہوتے ہیں۔ لکھتے ہیں :-

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصرِ ملا اور ایک حور - اقامت جاودانی ہے - وہی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگی ہے اس تصور سے جی گھبراتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ وہ اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی - وہی زمرد کا کاخ وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دور وہی ایک حور - بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔"

غالب و اقبال کا ماحول ہر چند کہ ایک دوسرے سے قطعی جداگانہ تھا۔ پھر وہ دونوں ماحول سے کچھ خوش نہ تھے۔ اقبال کسی وقت اپنے ماحول سے اس قدر نالاں تھے کہ ان کا شاہین پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرنے کے بجائے کنجشک فرومایہ کی طرح کسی گوشہ میں گزر کرنے پر آمادہ تھا اُن کی اس بیزاری کا اندازہ اُن کی مشہور نظم "ایک آرزو" سے کیا جا سکتا ہے ؎

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب، — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے ہوں گریزاں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تصویر بھی فدا ہو

غالب نے بھی تین شعر کی ایک مسلسل غزل میں ماحول سے اِسی بیزاری کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار اور اگر مرجائے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اس میں شک نہیں کہ اس نظم میں اقبال کی تمام فنی صلاحیتیں سمٹ آئی ہیں اور زبان و بیان کے جو محاسن سہل ممتنع کے رنگ میں اس نظم میں مجتمع ہو گئے شاید اُن کی کسی دوسری اُردو نظم میں مل سکیں لیکن اسے کیا کیا جائے کہ جو قبول عام غالب کی مندرجۂ بالا تین اشعار کو میسر آیا وہ اقبال کی نظم کو نصیب نہ ہوا۔ بات یہ ہے کہ غالب کے اشعار میں جو حسرتناک پرخلوص تاثر کام کر رہا ہے وہ اقبال کے یہاں نہیں ہے اور اور یہ اسی تاثر کے ضعف و توانائی کا فرق ہے کہ غالب کے اشعار ضرب المثل بن گئے اور زندگی کی ہر شدید الجھن میں اس طرح ہمارے لب پر آجاتے ہیں کہ

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

غالب و اقبال کے ان چند مماثل پہلوؤں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں میں بڑی حد تک فکری یگانگت و تخیلی مناسبت ہے اور اقبال کے خیالات و افکار اگر غالب سے ماخوذ نہیں تو اُن کے معنوی فیض سے یکسر خالی بھی نہیں۔ غالب کے اسی معنوی فیض و فکری اشتراک کی بناء پر سر عبدالقادر بانگ درا کے دیباچہ میں یوں رقم طراز ہیں :-

"غالب و اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں مسئلۂ تناسخ کا قایل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اُردو فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اُس نے ان کی روح کو عدم میں بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہوں اور شاعری کے چمن کی آبیاری کریں اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور اقبال نام پایا"۔

اس اقتباس کا صرف یہ جملہ کہ: "غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں"۔ کارآمد ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ اقبال کی شاعری میں غالب کی روح کام کر رہی ہے یا یہ کہ اقبال کی صورت میں غالب نے دوبارہ جنم لیا ہے کسی طرح درست نہیں۔ اقبال کو غالب کی ارتقائی روح سمجھنا اقبال سے خوش عقیدگی کے بناء پر ہو تو ہو واقعات سے اُنھیں ثابت کرنا مشکل ہے۔ بالخصوص اُردو شاعری میں اقبال کے یہاں غالب کی روح کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ ہر چند کہ اقبال کی مقبولیت میں سیاسی مصلحتوں اور مذہبی عقاید کو بھی دخل ہے لیکن اسے کیا کیا جائے کہ جو مقبول عام غالب کو میسر آیا وہ اب تک اقبال کو نصیب نہ ہو سکا۔ بات یہ ہے کہ غالب و اقبال دونوں بالکل متضاد ماحول کے ترجمان ہیں۔ اُن کی طبیعتوں کو متاثر کرنے والے خارجی حالات تو ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے ہی اُن کے داخلی نظام میں بھی بڑا فرق تھا چنانچہ دونوں کے طبائع میں یک گونہ اشتراک کے باوجود ہم اُنھیں ایک دوسرے کی بازگشت نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ دونوں کا مزاج فلسفیانہ تھا لیکن غالب صرف شاعر بن کر نکلے اور اقبال شاعر و فلسفی دونوں۔ غالب شاعری میں فلسفہ کی صرف ایک صفت یعنی موضوع کی کلیت و ہمہ گیری کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اُن کے یہاں انسان کے عام فطری تقاضوں، خواہشوں، ولولوں، مایوسیوں اور تجربوں کی عکاسی ہے، زندگی کے مختلف حقیقی اور دائمی پہلوؤں کی تشریح ہے انسانی محسوسات کے نفسیاتی تجزئے ہیں۔ اس کے برعکس اقبال کے یہاں ایک متعین و مخصوص فلسفۂ حیات ملتا ہے جو عقلی اور لچکدار ہونے کے باوجود بڑی حد تک نظری اور جامد ہے۔ اقبال اقتضائے بشری اور انسانی نفسیات کو اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں اور ایسا یزدان شکار و کمند آور رجائیت کا سبق دیتے ہیں جو زندگی کے عملی میدان میں اس قدر کارآمد نہیں جس قدر کہ وہ نظری طور پر معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے یہاں اکثر فلسفہ فن پر غالب آجاتا ہے، لیکن غالب کے یہاں فلسفہ ہمیشہ فن سے مغلوب رہتا ہے بقول شخصے :-

"غالب صدفی شاعر تھا اور ہر رنگ میں شاعر رہتا ہے کبھی خشک فلسفی نہیں نظر آتا۔ لیکن اقبال بعض اوقات فلسفہ نا دھنے لگتے ہیں اور اُن کی شاعرانہ و اعظانہ روپ اختیار کر لیتی ہے"۔

اس لئے خالص فنی نقطۂ نگاہ سے یہ خیال کرنا کہ اقبال، غالب کی ارتقائی روح ہیں کسی طرح درست نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح اقبال نے دوسرے حکماء اور علماء سے استفادہ کیا ہے وہاں خود اُردو کے ایک شاعر سے بہت کچھ لیا ہے اور بس!

عہدِ بنی اُمیّہ و بنی عبّاس میں کنیزوں کا اثر و اقتدار

(اڈیٹر)

ایک انسان کا دوسرے انسان کو غلام بنا کر رکھنا تاریخ انسانی کی نہایت قدیم یادگار ہے۔ اور اس کی ابتداء کا سراغ اس وقت سے چلتا ہے۔ جب دو افراد انسانی میں سے ایک نے اپنے کو قوی اور دوسرے نے ضعیف محسوس کرنا شروع کیا۔ غلامی نام ہے صرف قوت کے اعتراف کا اور قوت کا محبوب ترین مشغلہ یہی ہے کہ وہ مغلوب و کمزور پر حکومت کرے، اس کو ستائے اور خدمت و چاکری کی صورت میں برابر اس سے اپنی قوت کا اعتراف کراتا رہے۔

اس لئے دُنیا میں غلامی کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی۔ جب اول اول انسان میں قبایلی زندگی کا آغاز ہوا اور سردارانِ قبیلہ نے جنگ و مقابلہ کے بعد فتح و نصرت کا خراج انسانی خدمت کو قرار دیا۔ پھر چونکہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ حرب و جنگ بھی ترقی کرتی رہی اس لئے دُنیا میں اسی نسبت سے غلامی کا رواج بھی وسیع ہوتا گیا۔ اول اول اسیرانِ جنگ کو غلام نہیں بناتے تھے۔ بلکہ قتل کر ڈالتے تھے البتہ عورتیں محفوظ رکھی جاتی تھیں اور ان سے ہر طرح کی خدمت لی جاتی تھی۔ بعد کو یہ رواج اس قدر وسیع ہوا کہ زمانۂ امن و صلح میں بھی لوگ غلام بنائے جانے لگے۔ اور دُنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں تھا۔ جہاں یہ رسم قایم نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ قدیم مصریوں، اہلِ اشوریہ ہندوؤں، چینیوں، یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں وغیرہ تمام اقوام مشرق و مغرب نے مستقل بازار بردہ فروشی کے قایم کئے جہاں دوسری اجناس کی طرح انسان کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

اہلِ عرب عہدِ جاہلیت میں اسیرانِ جنگ کو بھی غلام بناتے تھے اور ان کو بھی جنھیں وہ پڑوس کی قوموں سے خریدتے تھے، چنانچہ غلاموں کے تاجر حبش وغیرہ کی طرف سے لونڈی غلاموں کی ایک جماعت ہر موسم میں عرب لے جاتے تھے اور وہاں کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔

قریش اس باب میں زیادہ مشہور تھے اور غلاموں کی تجارت وہ اسی طرح کرتے تھے جیسے دوسری چیزوں کی، چنانچہ اس قبیلہ کا سردار عبداللہ بن جدعان عہدِ جاہلیت میں نہایت مشہور تاجر غلاموں کا مانا جاتا تھا۔ (المسعودی صفحہ ۲۸۲ جلد ۱)

وہاں غلام بطور ہدیہ کے بھی دئے جاتے تھے اور دوسری ملکیت کی طرح وراثت میں بھی منتقل ہوتے تھے۔ جب کوئی شخص غلام خریدتا تھا تو اس کی گردن میں جانور کی طرح رسّی ڈال کر گھر کو لے جاتا تھا۔ (المعارف ابن قتیبہ۔ ص ۱۱۲)

قمار بازی کے سلسلہ میں بھی بعض لوگ غلام بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ابولہب اور عاصی بن ہشام نے آپس میں جوا کھیلا اور شرط یہ قرار پائی کہ جو ہارے گا وہ دوسرے کا غلام ہو جائے گا۔ چنانچہ ابولہب جیتا اور اُس نے عاصی بن ہشام کو غلام بنا کر اونٹ چرانے کی خدمت اس سے لی۔ (الاغانی ص ۱۰۰، ج ۱)

جب اسلام کا آغاز ہوا تو بردہ فروشی کا عرب میں انتہائی عروج تھا۔ اور دُنیا کی تمام دوسری قوموں کی طرح یہ بھی پوری طرح اس لعنت میں مبتلا تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کا رسم و رواج جو صدیوں سے چلا آرہا ہو دفعتہً نہیں مٹایا جا سکتا۔ بلکہ آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ اس میں اصلاح ہوتی ہے اس لئے اسلام فوراً اس کو بند تو نہ کر سکتا تھا، لیکن اس نے بعض اصول و قوانین ضرور ایسے پیش کئے جن پر عمل کرنے سے اس مذموم رواج کا کم ہو جانا اور غلاموں کی حالت میں اصلاح کا رونما ہونا لازم تھا۔ چنانچہ بردہ فروشی کے

دائرہ کو تنگ کرنے کے لئے اسلام نے صرف انھیں لوگوں کو غلام بنانے کی اجازت دی جو اسیرانِ جنگ کی حیثیت سے ہاتھ آئیں اور جو نہ مسلمان ہوں، نہ جزیہ ادا کریں۔ ہر چند یہ صورت بردہ فروشی کی وسعت کو کم کرنے والی تھی لیکن پھر بھی مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ اس کو وسیع ہونا تھا۔ اور ہوئی، چنانچہ بعض جنگوں میں ایک ایک سپاہی کو سو سو غلام اور سو سو کنیزیں تقسیم ہوئیں اور امراء و سرداران کو ہزار ہزار۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ہزار غلاموں کے مالک تھے۔ اور واقعۂ ارک کے بعد ایک ایک درہم میں لونڈی غلاموں کو فروخت کیا گیا۔ غلاموں کی کثرت کا ایک سبب عہد اسلام میں یہ بھی تھا کہ بربر وغیرہ کے بعض ذمی، جزیہ کے عوض غلاموں ہی کو پیش کرتے تھے۔

اسلام نے ایک طرف غلامی کا دائرہ تنگ کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف ان کی تعلیم و تہذیب کی ہدایت کر کے سوسائٹی میں ان کے مرتبہ کو بلند کرنا چاہا۔ چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے :-

"من کانت لھا جاریۃ فعلمھا واحسن الیھا وتزوجھا کان لھا اجران، اجر بالزواج والتعلیم واجر بالعتق۔

(یعنی اگر کوئی شخص اپنی کنیز کو تعلیم دے گا، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔ اور شادی کرلے گا تو اس کے لئے دو اجر ہیں۔ ایک اجر نکاح و تعلیم کے عوض میں، دوسرا آزاد کرنے کے صلہ میں۔)

چنانچہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ غلاموں کو بلاد اسلامیہ میں وہی حقوق حاصل تھے جن سے آزاد لوگ متمتع ہوتے تھے اور معاملات میں اتنی رعایت ملحوظ تھی کہ ایک غلام کو بہ نسبت آزاد کے نصف سزا ملتی تھی۔

لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے اور ان کو آزاد کر دینے کی ہدایت کرنا، اسلام کی بڑی زبردست حکمت تھی اور عربوں کے حالات و افتادِ طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس سے بہتر طریقہ اس رسم قبیح کے انسداد کا کوئی اور ہو ہی نہ سکتا تھا، چنانچہ تاریخ اسلام میں کثرت سے ایسے واقعات ملیں گے کہ لونڈیوں سے نکاح کرنے کے بعد ان کی اولاد نے سوسائٹی میں بڑا بلند مرتبہ حاصل کیا اور لوگوں نے کثرت کے ساتھ غلاموں کو آزاد کیا۔

جہاں تک اسلام کی تعلیم کا تعلق ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس رسم کے دور کرنے کی پوری کوشش نہیں کی، البتہ سلطنتِ اسلامی نے اس ہدایت کی غایت کو نظر انداز کیا اور بردہ فروشی کا سلسلہ امارت و سیادت کی اور بہت سی ناجائز خواہشات کی طرح، بدستور قایم رہا۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باوجود اس رسم کے قیام کے اس کی نوعیت بہت کچھ بدل گئی اور کنیز جو عہد اسلام سے قبل ایک جنس ناکارہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کی ذہنی دماغی و معاشرتی ترقی کس حد تک پہونچ گئی۔

گزشتہ بیان سے معلوم ہوا ہوگا کہ عربوں میں بعد آغاز اسلام کنیزوں کی کثرت کا سبب فتوحات کی وسعت تھی کہ باوجود ہزاروں کی تعداد میں آزاد کر دینے کے بھی ایک کثیر تعداد ان کے پاس رہجاتی تھی جب امارت و حکومت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے تمدن و معاشرت، عمران و تہذیب، جاہ و حشمت، شوکت و جلال میں ترقی ہوئی تو امراء و خلفاء کے حضور میں کنیزوں کے پیش کئے جانے کا دستور قایم ہوا، گویا کہ وہ بھی زر و جواہر کی طرح ایک چیز ہدیہ کے قابل سمجھی جاتی تھیں اگر معلوم ہوتا تھا کہ کس امیر کو صناعت کی طرف توجہ ہے تو اس کے سامنے صناع کنیز پیش کی جاتی تھی۔ اور اگر جاں و غنا کی طرف کوئی خلیفہ مایل ہوتا تھا تو انھیں خصوصیات کی حامل کنیز ڈھونڈھی جاتی۔ رفتہ رفتہ یہ دستور بہت وسیع و عام ہوگیا اور عہدِ بنی عباس میں تو اس کے تمام جمالیاتی پہلو کھل کر رہ گئے — کنیزوں کے ساتھ جب خلفاء عہدِ نکاح کر لیتے تھے تو انھیں آزاد کر دیتے تھے۔ اور پھر ان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ متوکل کے پاس ۴۰۰ کنیزیں تھیں۔ (المسعودی ص ۲۷۹ - ج ۲) اور ہارون الرشید کے پاس ۲۰۰۰، جن میں سے ۳۰۰ ارباب نشاط میں شامل تھیں۔ اور گانے بجانے کی ماہر تھیں۔ (الاغانی ص ۸۸، ج ۲) محض زینت و آرایش اور نمایش جاہ و جلال کے لئے بھی کنیزوں کو رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ زبیدہ اور ام جعفر برمکی کے پاس ہزاروں کنیزیں صرف

اس لئے تھیں کہ ان سے شان و شوکت کا اظہار ہو۔

جب فتوحات کا سلسلہ محدود ہوگیا اور لڑائیاں بند ہوئیں تو کنیزوں کی فراہمی بھی کم ہونے لگی، لیکن چونکہ لوگ ان کے رکھنے کے عادی ہوگئے تھے، اس لئے ایک جماعت بردہ فروشوں کی پیدا ہوگئی جو بلادِ ترک و صقالبہ، ہند، آرمینیا، روم، اور افریقہ وغیرہ سے نوجوان لڑکیاں کسی نہ کسی طرح لاتے تھے اور یہاں فروخت کرتے تھے۔

اس تجارت کے لئے یہاں بڑے بڑے بازار قایم تھے جہاں کنیزوں کی خرید و فروخت نہایت کثرت سے ہوتی تھی، بغداد کا بازار اس باب میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ بہت کھلے ہوئے میدان میں تھا اور اس کا نام "سوق الرقیق" یا "سوق النخاسین" تھا۔ اس میں متعدد مکان، دوکانیں اور احاطے تھے۔ جہاں مختلف ملکوں کی کنیزیں، عمر و رنگ، زبان و لباس، تہذیب و علم کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ رکھی جاتی تھیں۔ یوں تو یہاں سرکیشیا، روم، جارجیا، صقلبیہ، ایران، ارمینیا اور حبش وغیرہ تمام اطراف ملک کی کنیزیں آتی تھیں، لیکن سب سے زیادہ قیمتی وہ کنیزیں ہوتی تھیں جو مدینہ، طائف، بصرہ، کوفہ، بغداد و مصر سے حاصل کی جاتی تھیں، کیونکہ یہ نہایت ہی شیریں کلام اور حاضر جواب ہوتی تھیں۔

اس بازار کا ایک حصہ صرف ان کنیزوں کے لئے وقف تھا جو بالکل تازہ وارد ہوتی تھیں اور غیر تربیت یافتہ حالت میں فروخت کردیجاتی تھیں یہ بالکل عریاں حالت میں لائی جاتی تھیں۔ اس حال میں کہ ان کے بال کھلے ہوتے تھے اور زینت و آرایش کا کہیں نام نہ ہوتا تھا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ان کا طبیعی حسن جو صنعت آرایش سے علٰحدہ ہو۔ ہر شخص کو معلوم ہوسکے۔ بڑے بڑے تاجر، ان کی شکل و صورت، رعنائی و دلکشی کا اندازہ کرکے مختلف داموں میں خرید لیتے تھے۔ اور پھر ان کے فطری ذوق کے لحاظ سے ان کو تعلیم و تہذیب سے آراستہ کرکے بہت گراں قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ چنانچہ عہدِ اسلام کی بہت سی مشہور ماہر موسیقی، صاحب علم و فضل اور سیاست داں عورتیں انھیں کنیزوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

اول اول جب یہ بازار میں آتی تھیں تو اُن کی وحشت و خشونت کا وہی عالم ہوتا تھا جو ایک نوگرفتار ہرنی کے اضطراب کا، لیکن جب تعلیم و تربیت کے بعد، مکلف لباس سے آراستہ، اور فنِ دلربائی کی گھاتوں سے واقف ہوکر، ہاتھ میں رباب، زبان پر نغمۂ شیریں[1]، نگاہوں میں دلربایانہ افسوں اور جسم میں حرکات رقصیہ کا لوچ لئے ہوئے نکلتیں تو طبقۂ امرا میں تہلکہ مچ جاتا اور وہی کنیز جو چند درہموں میں خریدی گئی تھی، لاکھوں میں فروخت ہوتیں۔

اگر نفس بردہ فروشی کی کراہت سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ عرب کنیزوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے۔ وہ ان کے قوائے ذہنیہ کو تباہ کرنے والا نہ تھا بلکہ ان کو مہذب و شایستہ بنانے والا تھا۔ اس سلسلہ میں جس قدر وحشی و ناتراشیدہ عورتیں زیور علم و فضل سے آراستہ کی گئیں۔ ان کا شمار مشکل ہے اور انھیں کنیزوں میں جیسی جیسی صاحب علم و فضل عورتیں ہوئیں اور خود ان کے بطن سے جیسے جیسے خلفاء عظام اور علماء کرام پیدا ہوئے، ان کے حالات سے تاریخ عرب کے صفحات مالا مال ہیں۔

ان بازاروں میں کنیزیں علی العموم نیلام کی صورت سے پیش کی جاتی تھیں۔ یعنی جب کنیزوں کے خریدار خواہ وہ امراء ہوں یا تجار جمع ہوجاتے اور بازار مختلف ممالک کی کنیزوں سے بھر جاتا تو کنیزیں فروخت کرنے والے کھڑے ہوجاتے اور نہایت بلند آواز سے اپنی کنیزوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتے:-

---

[1] ان کے تغزل و غنا کا صحیح رنگ کیا تھا اس کا اندازہ اس وقت کے گیتوں سے ہوسکتا ہے۔ صاحب آغانی نے جابجا ان گیتوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے دو نہایت مشہور و محبوب وہ تھے جن کی ابتدا ان فقروں سے ہوتی ہے۔ "من کان لنا، لنالہ" (یعنی جو ہمارا ہے ہم اُس کے ہیں)۔ "وضع الخد للخوی عز" (فرط محبت سے گال پر گال رکھ دینا کس قدر پیاری بات ہے)

"یا تجار، یا ارباب الاموال ! ما کل مدوّر جوزۃ، وکل مستطیلۃ موزۃ ولا کل حمراء لحمۃ
ولا کل بیضاء شحمۃ، ولا کل صھباء خمرۃ ولا کل سمراء تمرۃ، یا تجار، ھذہ الدرۃ
الیتیمۃ التی لا تفی الاموال لھا بقیمۃ بکم تضنون باب الثمن"

(اے تاجرو، اے دولتمندو، نہ ہر گول چیز اخروٹ ہوتی ہے نہ ہر مستطیل چیز کیلا، ہر وہ چیز جو سرخ ہے گوشت نہیں کہلاتی اور نہ ہر سپید چیز چربی، اسی طرح نہ ہر صہبا شراب ہوتی ہے اور نہ ہر زرد چیز کھجور۔ اے تاجرو، یہ ایک بے بہا موتی ہے کہ زر خطیر بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتا۔ پھر بتاؤ کہ تم کیا قیمت اس کی لگاتے ہو)

اس آواز پر لوگ چاروں طرف سے گھیر لیتے اور بولی شروع ہو جاتی۔ کوئی چار ہزار دینار کہتا تو کوئی پانچ ہزار، کسی طرف سے چھ ہزار کی آواز آتی اور کہیں سے ۸ ہزار کی، الغرض اخیر میں سب سے زیادہ قیمت لگانے والا۔ وہ دُر بے بہا پاجاتا اور اپنے گھر چلا جاتا۔

یہ بھی قاعدہ تھا کہ (قدیم اہلِ رومہ کی طرح) غلاموں اور کنیزوں کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کر دیتے اور لوگ آ آکر انھیں دیکھتے اور ہاتھوں سے چھوتے۔ چونکہ یہ لوگ لونڈی غلاموں کے عیوب کو بالکل اسی طرح چھپاتے تھے۔ جیسے گھوڑوں کے عیوب چھپائے جاتے ہیں، اس لئے خریدار کو یہ حق بھی حاصل ہوتا تھا کہ وہ ان کو بالکل عریاں حالت میں دیکھ سکے۔

اہلِ عرب نے مختلف ممالک کی کنیزوں کی علٰحدہ علٰحدہ خصوصیات متعین کر کے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر نجابت کی جستجو ہے تو فارس کی لونڈیاں لی جائیں، اگر خدمت مقصود ہے تو رومہ کی کنیزیں تلاش کی جائیں، اسی طرح کھانا پکانے کے لئے حبش کی کنیزیں، اور بچوں کی تربیت و رضاعت کے لئے آرمینیا کی لونڈیاں مخصوص سمجھی جاتی تھیں۔ حُسن ظاہری کے لحاظ سے چہرہ ترکی کا، جسم روم کا، آنکھیں حجاز کی، اور گریمن کی پسند کرتے تھے۔

حال ہی کی بات ہے کہ بردہ فروشی کے انسداد سے قبل آستانہ، دمشق، قاہرہ وغیرہ کے بازاروں میں سرکیشیا کی کنیزیں عام طور پر بالکل عریاں حالت میں فروخت کی جاتی تھیں۔ بعد کو جب ایک بین الاقوامی قانون اس تجارت کے خلاف ہر جگہ نافذ ہو گیا تو لوگوں نے خفیہ طور پر اپنے گھروں میں اس تجارت کو جاری رکھا۔

قدیم زمانہ میں بھی کوئی قوم بردہ فروشوں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی۔ لیکن اسلام نے جس قدر اس پیشہ کی حقارت کی ہے شاید کسی نے نہیں کی۔ رسول اللہ کا ارشاد تھا کہ:- "التجارۃ فی الرقیق محقۃ" (یعنی بردہ فروشی قوم کو تباہ کر دینے والی ہے) کتاب الولید میں بردہ فروش اور شیطان کو ایک مرتبہ میں رکھا ہے۔ اسی لئے عساکر اسلامیہ کے ساتھ ان تاجروں کے رہنے کی سخت ممانعت تھی تاکہ وہ دشمن کے بچوں کو پکڑ کر غلام نہ بنائیں اور ان کی عورتوں کو اہلِ لشکر کے سامنے پیش نہ کر سکیں جیسا کہ اہلِ رومہ کا دستور تھا

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، بغداد اس تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اور جمیل ترین کنیزیں یہیں کے بازار میں آتی تھیں۔ اور نہایت گراں قیمت میں فروخت ہوتی تھیں۔ ان کنیزوں کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ تاجر اور خصوصیت کے ساتھ اس عہد کے مشہور مغنی، کسی کنیز کو اس کا ذہین قیافہ دیکھ کر خرید لیتے، پھر اس کو قرآن حفظ کراتے، ادب و نحو کی تعلیم دیتے، منزلی تہذیب سکھاتے، اشعار یاد کراتے، موسیقی کا ماہر بناتے، اور پھر بازار میں لاکر سو کے ہزار وصول کرتے۔ خوبصورت کنیزوں کو موسیقی کی تعلیم دینے کا بہت رواج تھا۔ کیونکہ وہ کنیزیں جن میں ان دونوں کا اجتماع ہوتا، بیش بہا چیز سمجھی جاتی تھیں۔ علی الخصوص مولدات (یعنی مکہ و طایف کی کنیزیں) کی نگرانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ایک کنیز کی قیمت ایک لاکھ دینار عطا کی (ابن خلکان، ص ۱۰۶، ج ۱) اسی طرح سلیمان بن عبدالملک کے بھائی سعید نے اپنی مشہور کنیز زلفاء کی قیمت ستر ہزار دینار ادا کی (الطبری ص ۱۳۳، ج ۲)۔ جعفر برمکی نے ایک کنیز ۴۰ ہزار دینار میں خرید کی (العقد الفرید، ص ۳۰۳، ج ۳)۔ ہارون الرشد نے عنان خلافت ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلا حکم یہ نافذ کیا کہ فلاں کنیز

ایک لاکھ دینار میں خرید کر لی جائے۔ اس کے وزیر یحییٰ بن خالد نے عذر کیا، رشید اس پر برہم ہوا تو یحییٰ نے بیت المال کی تمام چیزوں کو فروخت کر کے ۱۵ لاکھ درہم کی صورت میں اس کمرہ کے اندر رکھوا دیا۔ جہاں سے خلیفہ گزرا کرتا تھا۔ اس ترکیب سے خلیفہ کو معلوم ہوا کہ اس نے کنیز کے خرید کرنے میں کتنا بیجا صرف کیا تھا۔

ایک بار امین نے جعفر بن ہادی کو حکم دیا کہ ایک کنیز جس کا نام بذل تھا خرید کر لی جائے۔ جعفر نے انکار کیا۔ تو امین نے برہم ہو کر دوسرا حکم دیا کہ سونے کے برابر اس کو وزن کر کے قیمت ادا کی جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی۔ اور ۲ کرور درہم ادا کئے گئے۔

عہد بنی امیہ و بنی عباس میں کنیزوں کا مرتبہ اس قدر بلند ہو گیا تھا اور اتنا زبردست اثر ان کا خلفاء پر قایم تھا کہ حکومت و سلطنت گویا انھیں کے ہاتھ میں تھی۔

چنانچہ یزید بن عبدالملک کا عشق حبابہ کے ساتھ اور رشید کا ذات الخال کے ساتھ جیسی تاریخی شہرت رکھتا ہے سب پر ظاہر ہے رشید کی ماں خیزران خود کنیز تھی، اسی طرح خلیفہ مقتدر کی ماں سیدۃ الترکیہ لونڈی تھی۔ لیکن جو اثر ان کا سیاسیات وقت پر تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

الغرض عہدِ اسلام میں کنیزوں کے اثر و نفوذ اور قوت و اقتدار کا یہ عالم تھا کہ ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ خلفاء کی لونڈیاں تھیں، درست نہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ خود خلفاء اُن کے غلام تھے۔

اعتبارات

کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا بڑا صاحب اقتدار اور غیر معمی عقل و فراست رکھنے والا اس شہر کے وسط میں ایک کنواں تھا جس کے صاف و شیریں پانی سے شاہ و وزیر اور تمام شہر والے فایدہ اُٹھاتے تھے کیونکہ وہاں صرف یہی ایک کنواں تھا۔

ایک رات ساری بستی سو رہی تھی کہ کوئی ساحرہ چپکے سے آئی اور کنویں کے اندر سات قطرے کسی دوا کے ڈال کر بولی کہ "جو شخص اس کنویں کا پانی پیئے گا دیوانہ ہو جائے گا" صبح ہوئی سب نے حسب معمول کنویں کا پانی پیا اور ساحرہ کے قول کے مطابق سب دیوانے ہو گئے۔ لیکن بادشاہ اور اس کے وزیر نے پانی نہ پیا۔

جب یہ خبر تمام شہر والوں کو معلوم ہوئی تو وہ ہر ہر گلی میں دیوانہ وار پھر پھر کر بہ آواز بلند کہنے لگے کہ "ہمارا بادشاہ اور وزیر دیوانے ہیں ان میں اب حکومت کی اہلیت باقی نہیں رہی، اس لئے ہمیں چاہئے کہ انھیں معزول کر دیں"

شام کو جب یہ خبر بادشاہ کے کانوں تک پہونچی تو اس نے حکم دیا کہ اُس کنویں کا پانی لایا جائے۔ چنانچہ ایک کاسۂ زر میں وہ پانی لایا گیا۔ بادشاہ نے پیالہ لیکر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور جو پانی بچا تھا وہ وزیر کو پلا دیا۔

شہر کی تمام آبادی مسرور ہے کہ ہمارا بادشاہ راہِ راست پر آگیا اور اب وہ ہم پر حکومت کرنے کا اہل ہے۔

ایک صبح پہاڑ کی چوٹی پر یزدان و اہرمن کا اجتماع ہوا۔ یزدان نے اہرمن کو مخاطب کر کے کہا: "کیسا مزاج ہے"۔ اہرمن نے کوئی جواب نہ دیا۔ یزدان نے کہا:۔ "کیا آج مزاج بہت مکدر ہے"۔ اہرمن نے کہا: "ہاں، میں بہت ملول ہوں کیونکہ اب انسان کا یہ عالم ہے کہ وہ میرے تیرے درمیان کوئی تمیز ہی نہیں کرتا اور اکثر و بیشتر مجھے تیرے ہی نام سے پکارتا ہے۔

یزداں بولا:۔ "اے عزیز من، یہی تکلیف مجھے بھی ہے کہ اب لوگ اکثر مجھے تیرے نام سے پکارتے ہیں"۔ ایک طرف اہرمن افسردگی کے عالم میں چلا گیا اور دوسری طرف یزدان گردن جھکائے ہوئے۔

ایٹلانٹک سمندر سے ایک خط

بحر ایٹلانٹک - ۳۱ر اکتوبر ۱۹۵۵ء

در جستجوئے مانہ کشی زحمتِ سراغ
جائے رسید ایم کہ عنقا نمی رسد،

مولانائے محترم - سلام مسنون

یہ خط میں آپ کو ایک خاص جذبہ کے تحت ایٹلانٹک سمندر سے لکھ رہا ہوں - خیال تھا کہ ایران چھوڑنے سے پہلے آپ کو مفصل خط لکھوں گا - اور اپنے آیندہ پتہ سے مطلع کردوں گا - لیکن وقت کی تنگی اور مشغولیتوں کی زیادتی مانع رہی - مختصر سرگزشت یہ ہے کہ کم وبیش پانچ سال ایران میں ہندوستانی سفارتخانہ کی خدمات انجام دینے کے بعد اب میرا تبادلہ امریکہ ہوگیا ہے اور میں وہیں جا رہا ہوں ؎

صد بیاباں بگذشت و دیگری در پیش است

ایران سے ۲۸ر اکتوبر کو ہوائی جہاز سے روانہ ہوا - چار گھنٹہ میں لبنان کے مشہور شہر اور دارالسلطنت، بیروت آگیا - یہ مسافت اگر خشکی کے راستہ سے طے کرتا تو چار روز سے کسی طرح کم نہ صرف ہوتے - بیروت سے اٹلی آیا وہاں کے مشہور تاریخی مقامات یعنی نیپلس (جہاں پامپیائی کے کھنڈر ہیں) فلورنس اور روم دیکھے - پھر وہاں سے فرانس اور فرانس سے لندن آگیا - یہ ساری راہیں پانی کے جہاز اور ریل کے ذریعہ طے ہوئیں خلاصہ یہ ہے کہ اگر بیروت سے لیکر لندن اور پھر وہاں سے یہاں تک (کہ دس روز سے متواتر بحر ایٹلانٹک میں سفر کر رہا ہوں اور ۳۱ر اکتوبر یعنی چند گھنٹوں کے بعد امریکہ کے معروف عالم شہر نیویارک پہونچ جاؤں گا) کے حالات اور تجربات لکھوں تو اچھا خاصا سفرنامہ طیار ہوجائے - مگر میں نے اس وقت قلم اس نیت سے نہیں اٹھایا ہے - جو حکایت لکھنا چاہتا ہوں اس کی نوعیت کچھ اور ہے - جب ۲۲ر اکتوبر کو لندن پہونچا تو تین دن کے بعد ہمارا بقیہ اسباب جسے ہم نے اٹلی کے نامی بندرگاہ جنیوا میں ٹامس کسکس کمپنی کے حوالہ کردیا تھا، لندن آگیا - آپ بھاری سامان ساتھ لیکر یورپ کی ٹرینوں پر سفر نہیں کرسکتے - زیادہ سے زیادہ ایک یا دو متوسط سایز کے سوٹ کیس آپ اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں - چونکہ یہ اسباب مجھے لندن سے امریکہ بھیجنا تھا تو انھیں دوبارہ بک کرانے کے لئے واٹرلو اسٹیشن پر لایا - لندن میں دو تین روز سے رم جھم بارش ہو رہی تھی، میرے جوتے بیحد کثیف ہوگئے تھے - سامان کی لعنت سے نجات پانے کے بعد خیال ہوا ذرا جوتا صاف کروالوں سامنے ہی ایک دستے دار کرسی نظر آئی جس پر "بوٹ پالش" لکھا ہوا تھا - میں بے تکلف جاکر اس پر بیٹھ گیا اور جوتا صاف کرنے والا اپنے کام میں مشغول ہوگیا اس نے اپنے دونوں گھٹنوں کے نیچے ایک نرم سا تکیہ رکھا اور نیم استادہ ہوکر جوتے سے گیلی گرد دور کرنے لگا - میں نے اپنی عادت کے مطابق اس سے باتیں شروع کردیں :-

"تم، کب سے بوٹ پالش کا کام کر رہے ہو ؟"

"کوئی سات سال سے"

"اس سے پہلے کیا کرتے تھے — ؟"

اس نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا: - "موٹر بس چلایا کرتا تھا — چالیس سال تک بس ڈرائیور تھا —"
آئیں ؟ موٹر بس کے ڈرائیور تھے اور اب تم نے یہ پیشہ اختیار کر لیا ہے اور وہ بھی اس عمر میں"۔ میں نے انتہائی تعجب سے پوچھا۔
"تو کیا ہوا، مجھے یہ پیشہ بس ڈرائیوری سے زیادہ آبرومندانہ اور مفید معلوم ہوتا ہے" اُس نے اس طرح جواب دیا، جیسے وہ میرے تحیّر کو ایک بے معنی سی بات سمجھ رہا ہے ------

میرا ذہن ایک دوسرے ہی عالم کی سیر کرنے لگا -------- ایک قوم کی عظمت، بزرگی اور کامیابی کا حقیقی راز کیا ہے — ؟ کیا ہندوستان کا ایک عمر رسیدہ شخص جو بس یا موٹر کے ڈرائیور ہونے کا "اعزاز" حاصل کر چکا ہو، کبھی بھی جوتا صاف کرنے کا پیشہ رضا و رغبت کے ساتھ اختیار کر سکتا ہے ؟ - کیا ہماری قومی نکبت، ذلت اور فلاکت کا اصلی سبب ہمارا جھوٹا احساسِ وقار نہیں ہے ؟ - کیا ہماری سوسائٹی یا اجتماعی زندگی کی بنیاد بھی انھیں محکم، مضبوط، عاقلانہ اور پائدار اصولوں پر استوار ہے، جہاں پیشہ، پیشہ میں کوئی تخصیص، کوئی تفریق نہیں ------ جہاں اپنے بازوؤں سے کمانا اور اپنی محنت سے روٹی حاصل کرنا عزت کا حقیقی سرمایہ سمجھا جاتا ہو ------ ہم یورپی قوموں کو صرف شراب اور سؤر کے گوشت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں، ہم صرف ان کی عورتوں کی "برہنگی" اور "بے حجابی" ہی کا مضحکہ اُڑانا اپنا سب سے بڑا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں ---- لیکن ہم نے کبھی اپنے ذہن کو یہ زحمت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ آخر ایک قوم کیوں امام الاقوام بن جاتی ہے اور کیوں زندگی کی بہترین راحتیں، آسایشیں، اور ترقیاں اُسے نصیب ہو جاتی ہیں ------ میں نے بوٹ پالش کرنے والے سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے پوچھا: "تمھاری کیا عمر ہوگی — ؟"

"تمھارا اندازہ کیا ہے" اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"یہی کوئی اٹھاون، ساٹھ کے لگ بھگ ہوگے"

وہ ہنس پڑا — "نہیں - میرا سن اس وقت بہتّر سال کا ہے"

مجھے سخت تعجب ہوا اس لئے کہ اس کا چہرہ بھرا بھرا اور سُرخ و سفید تھا - آنکھوں میں چمک تھی - کاٹھی بہت ہی مضبوط اور بدن سڈول تھا - ہندوستان کے ستّر سال کے مزدور بوڑھے کی تصویر میری نظر میں پھر گئی - اللہ! کیا زمین و آسمان کا فرق ہے - ؟

"تمھارے کتنے بچّے ہیں ؟"

"پانچ - تین بیٹے - دو بیٹیاں، میرے تینوں بیٹے اچھی ملازمتوں پر ہیں اور کھانے پینے سے خوشحال ہیں"

مگر حیرت ہے کہ وہ اس عمر میں تمھاری مدد نہیں کرتے اور تمھیں اپنی روزی اپنی محنت سے کمانی پڑتی ہے — ؟ - یہ وقت تمھارے آرام کرنے کا تھا —"

"میں کبھی یہ پسند نہیں کر سکتا کہ میرے بیٹے میرا بوجھ اُٹھائیں" - اُس نے نہایت مضبوط لہجوں میں جواب دیا - "دوسرے اُن کی اپنی ذمہ داریاں اور فرایض ہیں - اس کے علاوہ ابھی میرے بدن میں کافی دم اور بازوؤں میں طاقت ہے - میں اُن کا احسان کیوں اُٹھاؤں - میری ایک بیوی ہے - اس کو البتہ کام نہیں کرنے دیتا - وہ کام کے قابل بھی نہیں"

"تمھارے بیٹے اپنی ماں کی بھی مدد نہیں کرتے"

"جب تک میں زندہ ہوں، اُنھیں یہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں"

"میں سمجھتا ہوں - تمھاری اولاد کو کچھ کچھ تمھاری مدد ضرور کرنی چاہئے - آخر تم نے اُنھیں پالا پوسا ہے، بڑا کیا ہے - انھیں اس کا احساس ہونا چاہئے" میں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"میں اُن سے مدد لینی تو نہیں چاہتا - ہاں یہ البتہ ہے کہ وہ مجھے پراگندہ حال اور بے پناہ نہیں دیکھ سکتے - اگر بہت بُرا وقت آجائے تو وہ پہلو تہی نہیں کریں گے"

"لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنی اولاد کے ہوتے ہوئے جبکہ وہ مالی حیثیت سے خوشحال بھی ہیں، اب تمھیں اس سن میں آرام کرنا چاہئے یہ عمر تمھارے کام کرنے کا نہیں ہے۔"

"تم یقین کرو" اُس نے ہر ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا: "کہ میں اس وقت تک آرام کرنا، یا دوسرے کا سہارا لینا نہیں چاہوں گا جب تک میرے بدن میں چلنے پھرنے اور کام کرنے کی صلاحیت باقی ہے"۔

میں نے دل میں کہا - یہی ایک قوم کی ترقی اور کامیابی کا راز ہے۔

مولانا — کیا عرض کروں — اس بوڑھے، بوٹ پالش والے کے اندر کتنی زبردست خود اعتمادی تھی جو اس کے قومی کیرکٹر کو پوری طرح واضح کر رہی تھی - واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک قوم اُونچائی حاصل کرتی ہے اور دُنیا میں اپنے لئے ایک ممتاز جگہ حاصل کر لیتی ہے تو اس کے حقیقی اسباب کچھ اور ہوتے ہیں - ڈانس، ڈنر اور لپ اسٹاک کی رنگینی ایک قوم کو اونچا نہیں کرتی۔

میں نے سوچا اگر لندن کے معروف سیر گاہ یا بہ اصطلاح تعیش گاہ، پیکیڈلی سرکس کے رنگین مناظر کا افسانہ سنانے کی فرصت اور ضرورت نہیں تو کم از کم اس واقعہ کا حال تو آپ کو لکھ کر بھیجدوں کہ سونچنے والوں کے لئے اس میں کافی سرمایہ حکمت و بصیرت موجود ہے۔

یہ خط میں نے ۵½ بجے صبح کو لکھنا شروع کیا تھا - اب قریب ۷ کے ہو رہا ہے - جہاز جو ۲۲۰۰۰ ٹن کا بھاری سمندری جہاز ہے آہستہ آہستہ نیویارک کے ساحل تک پہونچ رہا ہے - ہندوستان میں اس وقت شام ہو رہی ہوگی۔

یہ خط میں آپ کو اپنے نیویارک کے سفارت خانہ سے بھیج رہا ہوں - نیویارک سیٹی ایک عظیم الشان شہر ہے - جس کی سر بہ فلک عمارتیں ایسی ہیں کہ اگر انسان سر اُٹھا کر ان کی آخری چوٹی دیکھنا چاہے تو ٹوپی گر جائے۔ مکانات ستونی قسم کے ہیں گویا دیا سلائی کی ڈبیا میں جو ایک دوسرے پر رکھ کر آدھے آسمان تک پہونچا دی گئی ہیں - یہاں ایک عمارت بنام امپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے جو دُنیا کی سب سے بلند عمارت سمجھی جاتی ہے مگر آدمی نیم دقیقہ سے کم میں لفٹ کے ذریعہ اس کی آخری چوٹی تک پہونچا دیا جاتا ہے - یہ بارہ سو پچاس فیٹ بلند عمارت ہے۔

گرانی کا حال بھی سُن لیجئے - جوتے کے ایک جوڑ فیتہ کی قیمت ۱۵ سنٹ یعنی ۱۲½ آنے دینے پڑے جو شاید ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ ۲ر میں مل جائے گا۔

میں نے ایک سوٹ کی صرف استری کرانے کے لئے ایک ڈالر یعنی کم و بیش ۵ روپے دئے - لیکن یہ بہت جلدی کا کام تھا - گھنٹہ بھر میں کپڑے استری ہو کر مل گئے - اگر تین گھنٹے لگتے تو شاید نصف یعنی ۲½ دینے پڑتے - ناشتہ میں کم سے کم ایک روپیہ آٹھ آنے خرچ ہوتے ہیں - دو سینڈوچ کے ۲۰ سنٹ یعنی ایک روپیہ - ایک پیالی کافی کے دس سنٹ یعنی آٹھ آنے - چاء کی پیالی ۴ر آنے - یعنی ہوٹل یہاں ایسے ہیں جن کو اوٹومیٹ کہتے ہیں - یعنی لانبے لانبے خانے (چھوٹے پنجرہ) جیسے بنے ہوئے ہیں - ہر خانے میں طرح طرح کے سینڈوچ، کیک، روٹی مکھن رکھے رہتے ہیں - آپ کو جس طرح کی چیز مطلوب ہو اس کی قیمت لکھی رہتی ہے - آپ کو صرف اتنی قیمت شگاف میں ڈال دینی ہے - اور ایک معمولی سا ہینڈل جو شگاف سے لگا رہتا ہے اُسے گھما دینے سے، خانہ کا دروازہ خود بخود کھل جائے گا اور آپ کی مطلوبہ چیز آپ کے سامنے آجائے گی اسی لئے ایسے ہوٹلوں کو AVTOMAT کہتے ہیں - چاء یا کافی چاہئے تو شگاف میں سکہ ڈالئے - نیچے چھوٹی سی نل ہے اس کے نیچے پیالی رکھ دیجئے دودھ اور کافی ہر یک وقت اُس پیالی کے ٹھیک کنارے تک بھر جائے گی، وہاں سے اُسے اُٹھا کر اپنی میز پر

خود لائیے اور پیجئے۔ نوکر کی ضرورت نہیں نہ وہاں کوئی 'بیرا' ہوتا ہے۔

نیویارک شہر میں تجارتی فضا مستولی رہتی ہے۔ ٹرافک (سواریوں) کا انتظام نہایت باقاعدہ ہے۔ سڑکوں کے نمبر بھی بہت ہی نظم و قاعدہ کے ساتھ دئے ہوئے ہیں اگر آپ انگریزی جانتے ہیں تو پھر یہاں راہ کا گم کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ٹپس (بخشش) یعنی بخشش کا یہاں بیحد رواج ہے۔ ٹیکسی والے کو بھی اس کے کرایہ (میٹر) کے علاوہ کم از کم ایک روپیہ بخشش دینا پڑتی ہے۔ اگر نہیں دیں گے تو وہ آپ کو ایک بڑی تحقیر کی نگاہ سے دیکھتا ہوا چلا جائے گا۔ بعض تو باصرار وصول کر لیتے ہیں۔

ملل متحدہ کی عمارت نہایت متین مگر دیدہ زیب عمارت ہے۔ وہاں میں اپنے ملک کے علاوہ ایران کے ڈیلیگیٹوں سے بھی ملا۔ مسٹر نصر اللہ انتظام جو ایران کے نمایندہ ہیں اُن سے دیر تک فارسی میں باتیں ہوتی رہیں۔ ایک "ہندی" کو نیویارک جیسے شہر میں "فارسی میں باتیں کرتے دیکھ کر" انھیں "بہت حیرت" ہوئی۔

آج یعنی ۲ر نومبر کو میں اپنی جائے خدمت یعنی سانفرانسسکو جا رہا ہوں یہ نیویارک سے تین ہزار میل دور ہے اور بحر پاسفک کے کنارے واقع ہے۔ یہ مسافت میں ٹرین سے قطع کروں گا۔ تین روز لگیں گے۔ سانفرانسسکو، امریکہ کا "فردوس ارضی" سمجھا جاتا ہے۔ خود امریکنوں کا قول ہے کہ امریکہ کے تمام شہروں میں سانفرانسسکو سے بہتر شہر کوئی نہیں۔ ہوا وہاں ہمیشہ معتدل رہتی ہے۔ یعنی فردوسی کی زبان میں ؎

نہ گرم دگر نہ سرد و ہمیشہ بہار

سردست خدا حافظ

سید نظیر حسین

۲ر نومبر ۱۹۵۵ء

حضرت مانی جائسی :-

دامنِ ذرہ میں ہے وسعتِ صحرا لیکن
تو نہ دیکھے تو یہ کوتہ نظری تیری ہے

کیوں نہ ہر وقت نگاہوں میں پھرے صورتِ موت
جب میں بیمار ہوں اور چارہ گری تیری ہے

تیرا بالیں پہ گزر اور مرا مرجانا،
یہ خوشی ہے، ابھی میری تھی ابھی تیری ہے

دل کشی گیسوِ مشکیں کی دل افروزیِ رخ،
ظلمتِ شام و ضیائے سحری تیری ہے

دل میں کہرام ہے، میں پھر بھی ہنسوں گا اے دوست
اگر اس طرح کے ہنسنے میں خوشی تیری ہے

پیچ و خم تو رہِ ہستی کے عیاں ہیں مانی،
حیرت انگیز یہ بے راہ روی تیری ہے،

مشاعرۂ نگار

مصرعۂ طرح :- "کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو"

احسان درھنگوی :-

ہم سنائیں گے کہانی تمھیں میخانے کی — ختم کرلو حرم و دیر کے افسانے کو
یہ ادائیں، یہ نگاہیں، یہ جوانی، یہ جمال — "کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو"
تم محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھ تو لو — نیند کانٹوں پہ بھی آجاتی ہے دیوانے کو

اکرم دھولیوی :-

چوٹ اُبھر آئی اگر دل کی تو مشکل ہوگی — کیجئے یاد نہ بھولے ہوئے افسانے کو
شمع خاموش ہوئی چاند ستارے ڈوبے — اکرم اب ختم بھی کر درد کے افسانے کو

انجم انصاری دھولیوی :-

موت دُنیائے محبت میں ہے تجدیدِ حیات — زندگی کہتے ہیں ہم جی سے گزر جانے کو

حبیب آروی :-

جانے یہ کونسی منزل ہے محبت کی حبیب — خود تڑپنے لگا آیا تھا جو تڑپانے کو

رحمت - امروہوی :-

گھر کے بادل جو چلے آئے ہیں میخانے کو — کس نے ٹکرا دیا پیمانے سے پیمانے کو
فصلِ گل آئے کہ گلشن میں خزاں چھا جائے — اب تو راس آگیا صحرا ترے دیوانے کو

سالک انصاری نذر آبادی :-

شمع سے اپنی لگی خود ہی بجھائے نہ بنے — کون دے دادِ وفا بزم میں پروانے کو
غنچہ و گل کا ہو موسم کہ جنوں کا ہنگام — ایک لمحہ بھی سکوں اب نہیں دیوانے کو
نئے عنوان سے دو دعوتِ جلوہ ہم کو — ایک مدت ہوئی اب طور کے افسانے کو
دل شکستہ ہوں نہیں ضبط کی طاقت مجھ میں — کوئی دہرائے نہ گزرے ہوئے افسانے کو

شارق میرٹھی :-

آگئی یاد کسی کی نگہِ مست مجھے — ابھی ہونٹوں سے لگایا ہی تھا پیمانے کو
اب نہ ساغر کی ہوس ہے نہ تمنائے بہار — تیرے دامن کی ہوا مل گئی دیوانے کو
لذتِ تشنہ لبی یاد جو آئی شارق — رکھ دیا میں نے اُٹھا کر وہیں پیمانے کو

شفقت کاظمی :-

تیرے ملنے کی بھی صورت کوئی پیدا کرتی — یونہی سمجھاتی ہے دُنیا مجھے سمجھانے کو
اپنی محفل سے اُٹھا کر نہ پشیماں ہو کہ ہم — آئے تھے جرمِ تمنا کی سزا پانے کو

مظہر عارف :- تھا تو دامن کشِ دل عقل کا افسوں لیکن — شکر ہے وقت پہ ہوش آگیا دیوانے کو

انسان
(عہدِ حاضر میں)

(فضا ابن فیضی)

سحر گزر گئی خود روشنی کو ٹھکرا کر
پلی ہے رات مہ و کہکشاں کا غم کھا کر

سیاہ راتوں سے سورج ہیں مطمئن کتنے
سیاہیوں کی طرف مُڑ گئے ہیں دن کتنے

جھلک رہا ہے لہو زرفشاں گلاہوں میں
نمود فتنے کی ہوتی ہے خانقاہوں میں

خود آگہی و خودی کے ایاغ ٹوٹ گئے
ہوائے تند سے لڑ کر چراغ بجھ گئے

غریقِ زہرِ ہلاہل ہوئے سفینۂ نوش
خضر کے بھیس میں ہیں کس قدر ضمیر فروش

وہ جس کا سینۂ روشن تھا مایہ دارِ علوم
وہی ہے اب نفسِ جبرئیل سے محروم،

دلوں کے کنج میں کینے کا سانپ بستا ہے
وہ آدمی ہی ہے جو آدمی کو ڈستا ہے

یہ فکرِ عیش یہ تہذیب و کفر کے ناسور
یہ بے نگاہ کلیسا اور یہ خرابۂ طور

زمیں کے دوش پہ فکر و نظر کے یہ تابوت
یہ مقبرہ ہے الٰہی! کہ عالمِ ناسوت

تمام سعیِ کرم رائگاں ہوئی تیری
متاعِ سود سپردِ زیاں ہوئی تیری

نغمۂ نو

(حضرت دل شاہجہاں پوری)

بہار جلوے دکھا رہی ہے رباب نغمے سنا رہا ہے،
وہ مے نگاہوں سے ڈھل رہی ہے کہ زہد بھی جھومتا رہا ہے

چٹک چٹک کر ہر ایک غنچہ بہار اپنی دکھا رہا ہے
کوئی اِدھر مسکرا رہا ہے کوئی اُدھر مسکرا رہا ہے

اُداس سبزہ خموش غنچے نہال لرزاں صبا پریشاں
عجب فسانہ ہے وہ فسانہ مآلِ گل جو سنا رہا ہے

سرشک خوں ہیں کمالِ گریہ گداز دل ہے مآلِ گریہ،
کھنچے جو عشق و وفا کے نقشے اُنھیں یہ رنگیں بنا رہا ہے

سکوں شکن انقلاب یکسر تمام شورش تمام عبرت
ہمیں یہ ہنگامۂ زمانہ نئے فسانے سنا رہا ہے

سرورِ تسنیم کیفِ کوثر نشاطِ فردوس۔ چشمِ ساقی
جو ہے کئی میکدوں کا حاصل وہ جام گردش میں آ رہا ہے

حیات اک واہمہ سمجھئے نگاہ رفتارِ زندگی پر
یہ جا رہا ہے وہ آ رہا ہے وہ آ رہا ہے یہ جا رہا ہے

وہ گل فشانیٔ دمِ تکلم نشاط فردوس جس پہ قرباں
وہ اک تبسم جو حسن بن کر فضائے عالم پہ چھا رہا ہے

حریفِ اہلِ وفا زمانہ نئی نئی کروٹیں بدل کر،
ستم نصیبوں کی زندگی کے عجب فسانے سنا رہا ہے

یہی محبت کا مدعا ہے کہ خاک راہِ نیاز ہو جا،
زبانِ اہلِ نظر پہ اکثر بیانِ اہلِ وفا رہا ہے

سرورِ بادہ حیاتِ رنداں خمارِ بادہ ہے اک مصیبت
نگاہِ مستانہ ایک گردش کہ پھر اُنھیں ہوش آ رہا ہے

بہار نکھری چمن ہداماں، شگفتہ غنچے، نسیم خنداں
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے تو مسکرا رہا ہے

نہ جانے کیا مدعا ہے اے دل سحر سے تا شام دستِ قدرت
نئے نئے زندگی کے نقشے جو کھینچ کر پھر مٹا رہا ہے

مہتاب

(سیف جسن پوری)

ہمنشیں کتنا دل آویز ہے مہتاب کا حُسن!

تیرگی خوف سے لرزاں ہے اسی کے باعث
رات کی مانگ میں افشاں ہے اسی کے باعث
شاہراہوں پہ چراغاں ہے اسی کے باعث
دشتِ گلزار بداماں ہے اسی کے باعث
ریگزاروں بہاراں ہے اسی کے باعث

معترف کون نہیں اس کی فسوں کاری کا!

لیکن اے دوست جو خورشید نہ ہو جلوہ فشاں
سیمگوں دائرہ ہو جائے نگاہوں سے نہاں
ختم ہو جائے یہ سیّال بہاروں کا سماں
رات کی مانگ سے مٹ جائے شہابی افشاں
دیکھتے دیکھتے ہو جائے گلستاں ویراں

کھُل کے رہ جائے بھرم اس کی ضیا باری کا!

اتفاقات کی ہے دستِ نگر اس کی بہار
یہ اُجالا، یہ تبسّم، یہ جوانی، یہ نکھار،
اجنبی کرنوں پہ ہے اس کی سیاحت کا مدار
اِس کو خورشید نے بخشی ہے یہ رونق، یہ وقار
ورنہ سیّارۂ تاریک تجلّی یہ کنار؟

کس قدر دلکش و معصوم ہے تابندہ جمال!

علیگڑھ ALIGARH

بعض کمیاب کتابیں

تاریخ اُردو مطبوعہ

قدیم ہنر و ہنرمندانِ اودھ مصور --- اسرار حسین للعہ
احسن التواریخ - تاریخ صوبۂ اودھ مصور - منشی رام سہائے تمنا - معہ
محل خانۂ شاہی - فدا علی خنجر حالات محلات واجد علی شاہ - ۔ ۔ ۔

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے، قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی پر کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول)

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی، تازہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط، قیمت بارہ آنہ (علاوہ محصول)

مالہ و ماعلیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور اس کا ثبوت انھوں نے دور حاضر کے بعض اکابر شعراء مثلاً جوش، جگر، سیماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے۔ ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے، قیمت دو روپیہ

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان، اس کی انشا، عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے، عا، (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے، قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اردو غزل گوئی پر عہد بہ عہد ترقی، نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون ادبیہ و حقیقت نگاری، قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

فراست الید

اسکے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی پر پیشینگوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مینجر نگار لکھنؤ

REGD.N.A-466

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء

... ممالک بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے، مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے عا/

جنوری ۱۹۴۳ء

... خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول،

فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم و ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ عا/ (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے درخشاں کو نہ بھول جائیے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کیے گئے ہیں اس سال نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں ڈیس ہنڈی کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے۔ جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا تابناک ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے عا/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، قیمت دو روپے عا/ (علاوہ محصول)

جنوری، فروری ۱۹۵۳ء

داغ نمبر، جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور، حیدرآباد کے زمانے کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپے عا/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(فرمان روایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لیکر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت تین روپے سکے/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) زیر تتمہ۔ جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات و سکان کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ ہے (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ